خدّوخال
رحیم گُل

رحیم گُل

رابعہ بک ہاؤس بخشی مارکیٹ انارکلی لاہور

ناشر : ـــــــ نوید اے. شیخ
ادارہ : ـــــــ رابعہ بُک ہاؤس، لاہور
تعداد : ـــــــ ایک ہزار
بار دوئم : ـــــــ ۱۹۹۷ء
طابع : ـــــــ ندیم یونس پرنٹرز، لاہور
قیمت 60 روپے

ممتاز ناول نگار
رحیم گل
کی رحلت ایک لمحہ فکریہ

حسن رضوی

ممتاز ناول نگار اور ادیب رحیم گل نے جس کسمپرسی کے عالم میں دم توڑا ہے وہ تمام اہلِ قلم کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ رحیم گل جس نے تمام عمر اپنے ملک کی فضاؤں اس کے منظروں اور باسیوں سے والہانہ پیار کیا۔ بسترِ مرگ پر وہ خود پیار کرنے والوں سے محروم رہا۔ وہ ایک خود دار انسان تھا۔ اس نے اپنی حالت کے بارے میں کبھی کسی دوست سے ذکر تک نہیں کیا ان کی وفات سے چند روز پیشتر جب میں ہسپتال ان کی تیمار داری کے لیے گیا تو وہ بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ ان کے معالج ڈاکٹر مقصود نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کے پاس تو اتنے پیسے ہی نہیں کہ ان کے لیے ادویات اور ٹیسٹوں کے اخراجات کا بندوبست کر سکیں۔ شاید رحیم گل کی بیماری کی شدت کی اصل وجہ بھی یہ تھی کہ ان کا معقول علاج نہ ہو سکا میں نے اس بارے میں فوری طور پر رائٹرز گلڈ کے کرتا دھرتا محمد طفیل نقوش

کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا کہ گلڈ کی جانب سے ان کے لیے کچھ رقم مہیا کی جائے تو انھوں نے ایک ہزار روپے گلڈ کی جانب سے اور پانچ سو روپے اپنی جانب سے انہیں پہنچانے کی حامی بھری اور تھوڑی دیر بعد یہ رقم خود محمد طفیل صاحب نے ان کے لواحقین تک پہنچائی۔ لیکن اس رقم سے اب کیا بن سکتا تھا ایک تو وقت ہی کافی گذر چکا تھا، دوسرے حکومت کو ادیبوں کی جانب سے کی گئی سرکاری علاج معالجے کی اپیل بھی رائیگاں گئی، تیسرے اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے بھی کوئی اطلاع نہ ملی۔ ایسی صورت میں رحیم گل کا خاموشی سے رخصت ہو جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کاش اکادمی ادبیات پاکستان فوری طور پر ان کی امداد کے سلسلے میں قدم اٹھا لیتی تو ہمیں ایک سچے اور کھرے ادیب پر یوں آنسو بہانے نہ پڑتے۔ ہمیں اس لمحے مسیح الدین احمد صدیقی سابق ڈائرکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان یاد آرہے ہیں جنھوں نے ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی ادیبوں کی جس طرح خدمت کی وہ قابل ستائش ہے۔ ایسے مواقع پر وہ خود تیمارداری کے لیے پہنچ جاتے تھے یا پھر اپنے کسی نمائندے کو فوراً بھیج دیتے تھے۔ سنا ہے رحیم گل کے قل کے موقع پر اکادمی ادبیات پاکستان کا امدادی چیک مرحوم کی بیگم کو مل گیا۔ چلیے یہ بھی غنیمت ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کو چاہیے کہ وہ معزز ادیبوں کے امدادی وظائف کے ساتھ ساتھ ایک خاص فنڈ بیمار ادیبوں کے لیے بھی حکومت سے مختص کرائے جو صرف اور صرف ایسے ادیبوں کے علاج معالجے پر صرف کیا جائے۔ جو ذاتی طور پر اپنے علاج کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔

***

فہرست

رحیم گل کی دیگر تصانیف

تن تارا را

وادیٔ گماں میں

جنّت کی تلاش

پیاس کا دریا

وہ اجنبی اپنا

داستاں چھوڑ آئے

زہر کا دریا

پورٹریٹ

خدّوخال

آپ کا کسی عدالت میں جانے کا اتفاق ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، سُنا ضرور ہو گا کہ کٹہرے میں کھڑا ہونیوالا ہر شخص حلف لیتا ہے" جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا" رحیم گل نے زندگی کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہی، خدا اور خلق سے ہی نہیں، اپنے آپ سے بھی سچ لکھنے کا عہد کیا تھا اور اس کے لیے حلف لیا تھا جسے اس نے آخری سانس تک پورا کیا!

دنیا میں قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں جس کے لیے کہا جا سکے کہ اس میں سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر بغیر کسی مماثلت اور مشابہت کے کہا جا سکتا ہے کہ رحیم گل کے زیر نظر خاکے ان معنیٰ میں مکمل سچائی پہ مبنی ہیں کہ اس نے جو کچھ محسوس کیا، جوں کا توں لکھ دیا، بغیر اس خیال کے کہ متعلقہ شخص راضی ہو گا یا ناراض؟

مثال کے طور پر وہ احمد راہی کے متعلق لکھتا ہے" ماہ رمضان میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا، نہایت اہتمام اور مستقل مزاجی سے تیس کے تیس روزے رکھتا ہے، لیکن عید کا چاند نظر آتے ہی آخری روزہ شراب سے کھولتا ہے"! حبیب جالب کے متعلق لکھتا ہے:" حبیب جالب کو کون سمجھائے، بھلے آدمی تم جو نہ شہزادے ہو نہ صاحبزادے نہ اخوند زادے، تم تو رئیس زادے بھی نہیں، پھر کس بات پہ سیاست کرتے ہو"۔ امجد اسلام امجد کے متعلق لکھتا ہے" اگر گنجا نہ ہوتا تو

خوب صورت آدمی ہوتا۔ دنیا کے تمام گنجوں کو کمپلیکس کیوں ہوتا ہے؟ خدا کی قسم مجھے تو اصلی گنجے انتہائی معتبر لگتے ہیں"۔ انتظار حسین کے متعلق لکھتا ہے" انتظار حسین اچھا لکھنے والا ہے۔ لیکن جس قاعدے کلیے کا وہ ذکر کرتا ہے، انتظار حسین کو اس پر پرکھا جائے تو نتیجہ بے حد صبر آزما ہوگا"۔ اشفاق احمد خان کے متعلق لکھتا ہے" وہ ریڈیو کے لیے لکھتا ہے کہ چولہے کی آگ سلگتی رہے، وہ فنون اور نقوش کے لیے نہیں لکھتا کہ واہ واہ سے کاروبار حیات نہیں چلتا"۔ ایک بات طے ہے، اشفاق احمد کے ڈرامے متحرک نہیں ہوتے، وہ کھڑے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ رک جاتا ہے ایک کمرے میں، ایک گھر میں۔ نام نہاد ادیبوں کے بارے میں لکھتا ہے" کسی نے سارتر کو پڑھا، کسی نے ایلٹ کو، کسی نے رسل کو، کسی نے نتھو کو، اور کسی نے خیرے کو، ایک آدھ باب، ایک آدھ کتاب پڑھنے سے منزل متعین ہوگئی اور فکر و خیال کی جگالی شروع ہو گئی، اب کوئی نہیں بچ سکتا۔

رحیم گل نے زندگی کے حقائق کو جس سچائی اور خوبصورتی کے کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔ مثلاً: "ایک روز فلم دیکھنے چلا گیا۔ فلم زیادہ تر لڑائی مار کٹائی پر بنی تھی، میں فلم بھی دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا۔ ایک سین میں قاتلوں کی کار سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میری چیخیں نکل گئیں اور میں روتا ہوا سینما ہال سے باہر نکل گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن میں خود فلم پروڈیوسر بنوں گا" میرا اپنا تجربہ ہے کہ بعض اوقات انسان اچھی کتاب پڑھ کر سرشار ہو جاتا ہے۔ مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان شک و شبہات میں گھر جاتا ہے اور آگہی کے اندھیرے اُسے پاتال کی سمت ڈال دیتے ہیں"

یہ رموز کی لڑائی تھی، رموز کی آشنائی تھی۔ بیس سال تک ہم نے

اس روایت کو برقرار رکھا، وہ بیحد انا پرست امرتسری، میں انتہائی روایت پرست سرحدی، یہ جھوٹی انا کی جنگ ہوتی تھی۔ ورنہ ہم واقعی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔" فریب کی بات کرتا کہ مارکیٹ میں بھاؤ لگتا۔ جھوٹ جیسے چال ومال کی طرف دھیان دیتا تو کچھ پلے بھی پڑتا بیسویں صدی اور سچ۔" "جالب کبھی وزیر نہیں بن سکتا، جالب کے طبقے کے لوگوں کو وزارت راس نہیں آتی، کبھی بھول چوک سے قلمدان وزارت مل بھی گیا تو جو حال رامے کا ہوا وہی اس کا ہوگا، پھر گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ اس طرح کے سچے لیڈر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتے۔ پیدا ہوتے ہیں تو کھوٹے سکے کی طرح چلتے نہیں۔" انقلاب آئے تو چپ رہو، انقلاب کامیاب ہو جائے تو انقلابیوں کے نعرے میں شامل ہو جاؤ، یوں زندگی آسان ہو جاتی ہے۔" سب کچھ ہار دینے کے باوجود عزم ویقین کی دولت اس کے پاس تھی جو شباب کو شباب کیرانوی بنا گئی۔" نری ذہانت بھی کوئی چیز نہیں ہوتی اور محض ٹیکنیکل ادراک بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خوبصورت اور کامیاب زندگی کے لیے اعتدال بے حد ضروری ہے۔" انتہا پسند لوگ وقت سے پہلے مرجاتے ہیں اور خوفزدہ لوگ مرمر کر جیتے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو اعتدال برتتا ہے۔"۔ روپیہ ٹوپی نہیں کہ ایک اتارلی، دوسری سر پر رکھ لی۔" "بند گلی کا گھر کتنا ہی محفوظ ہو، راستہ ایک ہی ہوتا ہے، یہی اس کی خرابی ہے۔" کوئی کسی کے کہنے پر نہیں چلتا، کوئی مسجد جاتا ہے، کوئی مندر اور کوئی گرجا جاتا ہے، ہر ایک کا اپنا راستہ ہے۔" لوگوں کے اندر جھانکنے کا فائدہ؟ جو محبت آشنا نہیں اُسے اپنی دنیا میں رہنے دو، جو اندر نہیں آتا اُسے گلی میں ملو۔" جو لوگ اشفاق احمد کی مخالفت کرتے ہیں، میری طرح مقدر کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ محروم لوگوں کے پاس مذمت کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟" "پی آر کا سلسلہ بھی رواں،

دواں، کالم لکھنے والوں کو سلام، ریڈیو والوں کو پرنام، ٹی وی والوں کیلئے چائے کا اہتمام اور ایسے ویسوں کے لیے دشنام۔" چائے آتی تھی تو بل کے لیے منیر جلیس کی طرف دیکھتا تھا، جلیس مصلح الدین کی طرف اور مصلح الدین منیر کی طرف۔

رحیم گل کے پیش نظر خاکے نشاہد ہیں کہ وہ کھرا ادیب تھا۔ طرزِ بیان پسندیدہ ہی نہیں دل میں اُتر جانے والا ہے کیونکہ جو کچھ اس نے لکھا سچ ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں ہے اور ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

زبان کے سلسلے میں یار لوگوں نے اقبال کو چھوڑا نہ غالب کو، رحیم گل تو پھر رحیم گل ہے، کوہاٹ کے ایک گاؤں کا رہنے والا، مگر اُس کی زبان کسی اہلِ زبان سے کمتر نہیں، اردو تو ویسے بھی لشکری زبان ہے، سات زبانوں کا مرکب، اس پر کسی کا ٹھیکہ نہیں، جو لوگ ٹھیکیدار بنتے ہیں وہ اردو کے دوست نہیں، دشمن ہیں، زبان جتنا پھیلے گی اتنا ہی بڑھے گی، اتنا ہی خوبصورت ہو گی۔

زبان کے بارے میں غالب جیسا شاعر کہہ گیا ہے ؎

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

پھر کوئی کیا دعویٰ کرے اور کوئی کیا مانے؟ بیان کے بارے میں جیسے استاد نے کہا ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

پھر کوئی احمق ہی ہو گا جو یہ دعویٰ کرے کہ اس کا ہمسر کوئی نہیں۔ بہت سے لکھنے والے ہیں اور یقیناً اچھا لکھنے والے ہیں۔ مگر ان اچھا لکھنے والوں میں رحیم گل کا اپنا مقام ہے جو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا!

زیر نظر شخصی کے خاکے اپنی نظیر آپ ہیں اور دنیائے فن میں ایک خوبصورت اضافہ، انھیں پڑھ کر آپ لطف اندوز بھی ہونگے اہم ادبی شخصیات کے شب و روز اور مقام و مرتبے سے آگاہی بھی حاصل کریں گے اور زندگی کے حقائق پر بھی مفید معلومات حاصل کریں گے۔
آخر میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ رحیم گل نرا خاکہ نگار نہیں تھا بلکہ بہترین ناول نگار بھی تھا۔ اُس کے ادب پارے "تارارا"، "پیاس کا دریا"، "زہر کا دریا"، "پورٹریٹ"، "داستان چھوڑ آئے" اور "جنت کی تلاش" عرصہ ہوا شائع ہو کر قبول عام اور شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں!
اس کتابچے میں بائیس خاکے شامل ہیں اور سب کے سب ایسے معروف اور محبوب شاعروں اور ادیبوں کی شخصیات سے تعلق رکھتے ہیں جن کے متعلق شاعری اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش اور جستجو رکھتے ہیں۔ رحیم گل نے ایسے تمام اہلِ ذوق اور اہلِ تجسّس کے لیے جانکاری کا دسترخوان سجا دیا ہے تاکہ وہ طلب اور تجسّس کی گھاٹیوں سے نکل کر تسکین اور راحت کی وادیوں اور سبزہ زاروں میں داخل ہو جائیں۔ رحیم گل تو رخصت ہو گئے، اب ہم نے یہ خاکے آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ یقیناً آپ انہیں حاصل کر کے محظوظ اور مسرور ہوں گے!

پروفیسر عبدالمجید خان یوسف زئی

رحیم گل زندگی بھر زمین کا گز اور لاہور کا غبار بنا رہا
وہ لاہور کی ادبی محفلوں کی سہاگن کی مانگ کا سندور تھا

رحیم گلُ پندرہ روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر بالآخر اللہ کو پیارا ہو گیا اور لاہور کے احباب، جہاں اس نے زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا اُسے زندگی بھر کی رفاقتوں کے صلے میں نہ کندھا دے سکے نہ مٹی دے سکے، گو کہ کوئی دل جلا شاعر کہہ گیا ہے ؎

مٹھیوں میں خاک بھر کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

بہر حال یہ سعادت اہلِ کوہاٹ اور رحیم گلُ کے عزیزوں کے حصّے میں آئی، لاہور میں مرنے والا صرف اپنی داستان چھوڑ گیا جس کے نقوش دوستوں کے دلوں میں ابھی تازہ ہیں اور شاید بعض دلوں میں عرصہ دراز تک قائم رہیں گے۔ وہ شخص جو بھرپور مجلسی زندگی گزار گیا، جو لاہور کی ادبی اور فلمی محفلوں کی جان تھا اور جو اپنی چھڑی ٹیکتا ہوا کبھی بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتا، کبھی ٹیکسیوں اور رکشوں میں، لیکن بہر حال ہر ادبی محفل میں پہنچتا ضرور تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا کہ جیسے سر کے بل پہنچا ہے۔

یہ محض اس کا عزم تھا جو اس کو سرگرم رکھتا تھا اور وہ شہر میں بگولے کی طرح اڑتا پھرتا، خوش باش ہنستا مسکراتا، قلندرانہ وضع قطع کے ساتھ لاہور کی خاک سے مرتے مرتے جدا نہ ہوا، شاید مرنے والے کی حسرت بھی یہی تھی، بقول عدم ؎

مر کے ہم خاک کوئے یار ہوئے
سرمۂ چشم اعتبار ہوئے

لیکن بوجوہ یہ آرزو تو پوری نہ ہوئی البتہ جگر کے الفاظ ہیں ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

گنگا رام ہسپتال کے بیڈ نمبر ۱۴ اور بیڈ نمبر ۹ پر پڑے پڑے دوستوں کو ٹک ٹک دیکھ کر آنسو بہانے والا، آنسوؤں کی زبان میں کیا کہنا چاہتا تھا۔ زبان تو بند تھی وہ جو مشکور حسین یاد جیسے بذلہ سنج شگفتہ بیان کا اپنی شگفتہ بیانی سے ناطقہ بند کر دیا کرتا تھا جو تاج سعید کو اپنے استدلال سے خاموش کر دیتا تھا اور جس نے عروس البلاد لاہور کے تمام اہل قلم کے خاکے لکھ کر نگار خانہ قائم کر دیا تھا اور جس کی دقت نظر سے کسی شخصیت کا کوئی جلی یا خفی پہلو پوشیدہ نہ تھا وہ مرتے مرتے کیا کہنا چاہتا تھا، افسوس کہ یہ اسرار رحیم گل کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

حال ہی میں ایک ادبی ریفرنس میں رحیم گل کے بارے میں، اس کے فن کے بارے میں اور اس کے روزگار کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین شفیق الرحمٰن نے جو رحیم گل کے سلسلے میں خصوصی دلچسپی لی، اس کا بھی ذکر ہوا۔ لئیق اختر نے فلمی صنعت کی انجمن کے کھاتے سے جو کچھ فراہم کیا اس کا بھی ذکر چھڑا لیکن ابھی تک یہ طے نہ ہوا کہ مرحوم کے

پس ماندگان جو لاہور میں ہیں ان کی باقاعدہ کفالت کی کیا صورت نکلے گی اور جو مسودات اور کتابیں تصویر کی منزل سے گزر چکی ہیں ان کی طباعت اور اشاعت کا کیا بنے گا۔ جہاں تک لاہور کی ادبی محفلوں کے اجڑنے کا معاملہ ہے وہ تو اہلِ دل کے لیے بقول شاعر ایک عزم چھوڑ گیا ہے۔

شکستہ پا کو بھی اب ذوقِ رہ نوردی ہے
دلوں میں ہم نے وہ دھن منزلوں کی بھر دی ہے

ڈاکٹر آغا سہیل
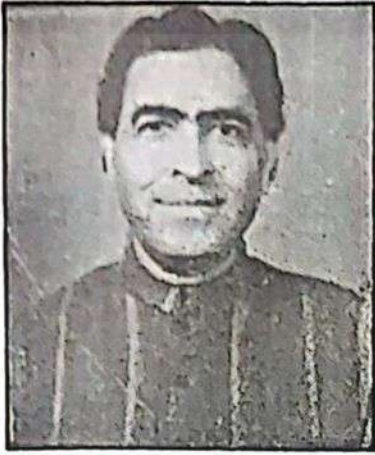
ٹی ہاؤس

میرا نام ٹی ہاؤس ہے ۔۔۔۔

میرا بسیرا شاہراہ قائدِ اعظم کے بغل میں ہے۔ میرے دوسرے بغل میں نیلا گنبد اور انار کلی ہے، میرے سامنے کافی ہاؤس اور میرے پیچھے وائی ایم سی کی عمارت ہے۔ میرے بالکل قریب ایک چوراہا ہے۔

لیکن خود میرا ایک ہی دروازہ ہے جو اندر آنے کا راستہ ہے۔ باہر جانے کا راستہ بھی۔۔۔۔ اسی دروازے سے شیر اندر آتا ہے، اسی دروازے سے بکری اندر آتی ہے۔

لاہور میں بلکہ پورے ملک میں یہ فخر مجھے حاصل ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں ۔۔۔۔ ؟

میرے ہر ٹیبل کا مزاج الگ ہے، کسی پر استاد گرامی بیٹھتا ہے۔ کہ اسناد ادب تقسیم کر رہا ہے۔ کسی پر نو آموز طالب ادب بیٹھتا ہے کہ گرو کی سخن ہائے گفتنی اور ناگفتنی جذب کر رہا ہے۔

کسی ٹیبل پر انقلابی بیٹھا ہے کہ طلوع سحر کا مژدہ سنا رہا ہے۔ کسی پر کمیونسٹ، کہ سرخ سویرے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ کسی پر نیشنلسٹ، کہ اس سے بڑا اعزاز دوسرا نہیں ہے۔

میرے ہر ٹیبل پر کوئی نہ کوئی مکتبۂ فکر موجود ہے۔

میرا ظرف اتنا بڑا ہے کہ ہر مکتبۂ فکر کی سوچوں کو ہضم کر جاتا ہوں۔

"سویرا" "طلوع" "روشنی" یقین اور امید جیسے الفاظ سُن سُن کر میں بہت رجعت پسند ہو گیا ہوں۔۔۔ اس لیے اندھیرے، تاریکیاں اور محرومیاں میرے لیے حرفِ غلط بن چکی ہیں۔

میں مرکز ہوں ذہانت کا، فطانت کا، اہلِ دانش کا، وہ لوگ جو دوسروں میں روشنی بانٹتے ہیں۔ میری چھت کے نیچے روشنی کی تلاش میں آتے ہیں۔

انتظار حسین کو دیکھئے، حبیب جالب کو دیکھئے، جو کسی کو نہیں مانتے، مجھے مانتے ہیں، میری کشش انہیں کھینچ لاتی ہے۔

انیس ناگی جیسا شخص پہلو بلکہ بے پہلو فنکار، جس نے بڑے بڑوں کو ٹھینگا دکھایا، مجھے مانتا اور جانتا ہے۔

مجھ سے اچھی چائے شیزان میں ملتی ہے اور مجھ سے سستی چائے دوسرے چائے خانوں میں۔ لیکن نصیب اپنا اپنا، کچے دھاگے سے چلے آتے ہیں سرکار بندھے۔

زاہد ڈار ہو کہ احمد مشتاق، کہ یونس جاوید، ان کی خلوت مجھ میں جلوت ہے۔ یہاں اسرار زیدی کا ڈیرہ بھی جمتا ہے۔ یہاں مستنصر بھی اپنی سفری کٹ کے ساتھ براجمان ہوتا ہے، شوق آوارگی، چھوٹے قاسمی کو بھی کھینچ لاتی ہے۔۔۔ اقبال ساجد کو میری دیواروں میں آغوشِ مادر کا سا سکون ملتا ہے۔۔۔ مبارک احمد بھی اپنی ٹوپی کے ساتھ کسی کونے کھدرے میں موجود ہوتا ہے۔ سراج منیر کے لیے بھی الگ ٹیبل ریزرو ہوتی ہے۔ الطاف قریشی میری دہلیز کے قریب بیٹھ کر مونچھوں کو تاؤ دیتا رہتا ہے۔۔۔ خالد احمد مہینے میں ایک بار بھی آجائے تو سارے مہینے کی حاضریاں لگ جاتی ہیں۔

شہزاد احمد تو اس روز ہمارے تنور میں روٹیاں نہیں پکتیں،

لوگ انہیں کو سونگھ سونگھ کر گزارہ کر لیتے ہیں۔
ہر گرو کے ساتھ ایک دو چیلے ہوتے ہیں۔ یہ گرو چیلے کا ناتا میرے مفاد میں ہوتا ہے۔ کیونکہ دو چار برس بعد چیلہ گرو بن چکا ہوتا ہے۔ اس کا گزارہ بھی چیلوں کے بغیر نہیں ہوتا اور سلسلہ وار درس جاری رہتا ہے۔
میرا نام ٹی ہاؤس ہے۔ میرا ایک ہی دروازہ ہے۔ میں سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہوں کیونکہ میری ایک ہی آنکھ ہے۔ یہی وجہ کہ محبت کرنے والے اور نفرت کرنے والے سب میرے بطوں میں آکر غیریتیں بھول جاتے ہیں۔ تب آنے والوں کے لیے مسکراہٹ اور جانے والوں کے لیے گالی کا کاروبار ان کے دلوں میں رہ جاتا ہے۔
میں سب کی ہوں اور سب کا ہوں، میں سارے ادبی حلقوں کی ماں بھی ہوں، باپ بھی ہوں۔
یہ لوگ جب حلقوں کی میٹنگوں سے لہو لہان ہو کر واپس آتے ہیں۔ تو میرے ہی شفقت پدری اور آغوش مادری میں پناہ لیتے ہیں ۔۔۔
فلم کے لوگ چائے کی پیالی میں گولڈن جوبلی کا طوفان لانے کے لیے مشہور ہیں مگر میرے یہ دانشور بچے ادبی محفلوں میں جوشِ رقابت کے ایسے ایسے روح پرور نکتے تخلیق کرتے ہیں کہ کافر مسلمان بن جاتے ہیں اور مسلمان انسان بن جاتے ہیں!
کسی نے سارتر کو پڑھا تو وہیں کا رہ گیا، کسی نے ایلیٹ کو کسی نے رسل کو، کسی نے منٹو کو، کسی نے غیرے کو۔
ایک آدھ باب، ایک آدھ کتاب پڑھنے سے منزل متعین ہو گئی اور فکر و خیال کی جگالی شروع ہو گئی ۔۔۔ اب کوئی بچ کر نہیں جا سکتا۔
اگلے دن ایذرا پاؤنڈ کا حوالہ، استاد امام دین کا حوالہ، مجاہد اردو ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہور کا حوالہ، روز نت نیا ہتھیار، کوئی تیکھا جملہ،

کوئی کٹیلا فقرہ، مرعوبیت ہی مرعوبیت، پہلے مرعوب ہونا، پھر مرعوب کرنا، شب و روز یہی کھیل جاری رہتا ہے۔
پی، آر کا سلسلہ بھی رواں دواں، کالم لکھنے والوں کو سلام، ریڈیو والوں کو پرنام، ٹی وی کے لیے چائے کا اہتمام اور ایسے تیسوں کے لیے دشنام!
میرے بچے عجیب و غریب ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے۔ یہ میرے اصلی بچے نہیں یتیم خانے سے آئے ہیں.... خود مانگ تانگ کر گزارہ کرتے ہیں مگر بیروں کو ٹپ ضرور کرتے ہیں....
یہی وجہ ہے کہ کم تنخواہ کے باوجود ہمارے بیرے نوکری نہیں چھوڑتے بلکہ ایک آدھ تو شعر بھی چکنے لگا ہے۔
شاید ایسے ہی سمے کسی نے کہا ہوگا۔
"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے!"

❀❀

"غبی" اور "شکرا" اس کے
محبوب ترین لفظ ہیں

منیر نیازی

مجھے تو عطاء الحق قاسمی محض تکلفاً خانِ اعظم کہتے ہیں ایک میان میں دو تلواریں کہاں سماتی ہیں ؟

ربعہ صدی قبل میں ایک نوجوان سے ملا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سیاہ وو سٹڈ اور سرخ قمیص میں اس کا چہرہ اور زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ اس کے سیاہ بال بانکپن سے اس کی پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نیلگوں سی، بھوری سی دو بڑی شفاف آنکھیں اس کے چہرے پہ یوں جھلملا رہی تھیں جیسے سرخ ماربل میں سے دو چشمے ابل پڑے ہوں۔

ستواں ناک، مگر نتھنے کچھ زیادہ ہی کشادہ، غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کی قوتِ شامہ بہت تیز تھی اور وہ فطری طور پہ بوئے گل اور ماننس بو کی مکروہات اور خصوصیات کو پالیتا تھا۔

پہلی ملاقات میں ہی منیر مجھے اچھا لگا۔

وو سٹڈ کی پتلون، سرخ قمیص اور میلی بنیان کے سوا منیر کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، وہ جب بھی ملا، جہاں بھی ملا، قلندرانہ ملا۔

اس کا بستر کہاں ہے، چارپائی کہاں ہے، سوتا کہاں ہے یہ خود اُسے معلوم نہ تھا، اس کے دوستوں کو بھی معلوم نہ تھا۔

منیر بنیان بدلتا نہیں تھا، دھوتا بھی نہیں تھا، البتہ پیسے آجاتے تو نئی بنیان خرید کر پہن لیتا، پرانی پھینک دیتا، یا کسی دن نگہت آجاتی تو اس کی ساری میل اتار جاتی ......؟

یہ بے پناہ تمکنت بھری خوبصورت لڑکی منیر کے لیے ایک کنیز زادی سے زیادہ نہ تھی، وہ کیسے کیسے نخرے برداشت کرتی تھی منیر کے۔

ایک بار منیر نے منظم زندگی گزارنے کا پلان بھی بنایا تھا۔ (اس طرح کے منصوبے وہ اکثر بناتا رہتا ہے جو کبھی پروان نہیں چڑھتے) ان دنوں منیر نے ابراہیم جلیس اور مصلح الدین سے مل کر ریفل رینج پر کوٹھی کرایہ پر لی۔ خیال یہ تھا کہ جلیس فلم کے لیے کہانی لکھیں گے، منیر گانے لکھے گا اور مصلح الدین میوزک دے گا اور وہ لاکھوں میں کھیلیں گے، کبھی کبھی ہم بھی جلیس کی گپیں سننے کے لیے کوٹھی میں پہنچ جاتے تھے اور ہونے والے لکھ پتیوں کے بکھرے ہوئے میلے بستروں اور ٹوٹی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر ان کے شاندار مستقبل کی نوید سنتے تھے۔ چائے آتی تو بل دینے کے لیے منیر جلیس کی طرف جلیس مصلح الدین کی طرف اور مصلح الدین منیر کی طرف دیکھتا تھا۔

تین چار ماہ کے بعد یہ اتحاد ثلاثہ ٹوٹ گیا اور تینوں فنکار ہمیشہ کی طرح بے گھر ہو گئے۔

اشفاق احمد سے میرا پہلا تعارف منیر نے کروایا، جناب احمد ندیم قاسمی ابراہیم جلیس اور سبط حسن سے بھی پہلا تعارف منیر نے کروایا۔

البتہ یہ فخر مجھے حاصل ہے کہ اس لا اُبالی شخص کو پہلی بار فلم میں لے گیا اس نے پہلا گانا میری فلم کے لیے لکھا۔

منیر نیازی بڑا شاعر ہے یہ تو سب جانتے ہیں لیکن گفتگو میں اسے

جو ایک خاص ملکہ حاصل ہے وہ اس دور میں اسی کا حصہ ہے۔ وہ ایسے تیکھے فقرے چست کرتا ہے کہ گوند کی طرح چپک جاتے ہیں اور جس پہ فقرہ چست کرتا ہے اس کی ساری شخصیت مسخ کر کے رکھ دیتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے فیض اور حفیظ آج تک اس کے فقرہ بازی سے گھبراتے ہیں۔ قتیل بھی اس سے کتراتا ہے۔

وہ فیض کو فیض کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ مگر خود فیض اسے "خان صاحب" "خاں صاحب" کہہ کر اپنا تحفظ کرتے ہیں۔!

منیر بے حد ذہین آدمی ہے، بے حد حاضر جواب، بے حد نڈر، وہ محفل جماتا ہے خوب جماتا ہے۔ شاعری کی طرح گفتگو میں بھی اس کی اپنی ڈکشن ہے۔

"غبی" اور "شکرا" اس کے محبوب ترین لفظ ہیں، شکرا شاہین کی نسل کا پرندہ ہے لیکن شکرا جب منیر نیازی کی زبان سے نکلتا ہے تو اپنی ساری معنویت بدل دیتا ہے، تب وہ دھوکہ، فریب اور مکاری کی علامت بن جاتا ہے۔

جب فرد یا اجتماع پر اسے غصہ آتا ہے تو وہ جھنجلاہٹ میں "غبی" کا ایسا صحیح استعمال کرتا ہے کہ باید و شاید!

بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ بہترین نثار بھی ہے وہ خوبصورت طنزیہ مضامین لکھتا ہے لیکن اس کی شاعری اتنی بڑی ہے کہ ادھر کسی کی توجہ نہیں گئی۔

منیر نیازی پر خود پسندی کا الزام بھی لگتا ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے اسے کسی کی تحریر، کسی کا شعر پسند آیا ہے تو کھلے دل سے اعتراف بھی کرتا ہے خصوصاً نئی نسل کی راہنمائی میں بخل سے کام نہیں لیتا۔

منیر نیازی معصوم آدمی ہے۔ تمام تر ذہانت اور تیکھی گفتگو کے باوجود

اس میں فریب اور چالاکی نہیں ہے، وہ خواب دیکھتا ہے، ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے۔ لیکن جب بے ساختگی سے ہنسنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بالکل معصوم بچہ لگتا ہے جس میں کوئی شعر نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ منیر واحد آدمی ہے جو تمام تر خامیوں کے ساتھ پسندیدگی کی سند رکھتا ہے۔

منیر کی عادت ہے کسی تقریب کی صدارت کر رہا ہو یا خود تقریب اس کے اعزاز میں ہو رہی ہو، ایک دو بار سٹیج سے ضرور اترے گا، مجمع میں سے ہوتا ہوا باہر جائے گا اور چند منٹوں کے بعد واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ جائے گا۔

یہ اس کے لاابالی پن کا فطری رویہ ہے یا اظہار ذات کی شعوری حرکت، لوگ اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ مگر منیر نیازی ایسے غبی لوگوں کی تنقید کی پروا نہیں کرتا۔ اسے اپنی سیماب صفتی عزیز ہے جس نے اسے ممتاز اور منفرد بنا دیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب، ہم روزانہ ملتے تھے، خوبصورت لڑکیوں کی باتیں کرتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں بلا ناغہ شرکت کرتے تھے۔ پھر ہم دونوں نے یکے بعد دیگرے شادیاں کر ڈالیں۔۔

اب وہ بات نہ رہی تھی کہ آنے آنے کے بھونے ہوئے چنے چبا کر رات بسر کر ڈالی۔ غم روزگار نے ہمیں ایک دوسرے سے دور پھینک دیا۔۔

اب سال دو سال میں آمنا سامنا ہوتا ہے تو منیر نیازی کہتا ہے۔۔۔۔

یار رحیم گل۔۔۔ تمہاری طرف سے کبھی کبھار ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجاتا ہے تمہاری زبان پر اب بھی میرے لیے کلمہ خیر ہوتا ہے۔ تم سچ مچ بہت "غبی" آدمی ہو رحیم گل۔۔۔۔!

❀❀

پاکستان کا نمبر 1 لطیفہ باز

امجد اسلام امجد

اگر گنجا نہ ہوتا تو خوبصورت آدمی ہوتا ۔ ۔ ۔ !

مذاقیہ نہ ہوتا تو محترم آدمی ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ !!

عام فارغ از بال آدمیوں کی طرح "فنی" کوشش سے اپنے "سل بٹے" کو چھپاتا ہے ۔ ۔ ۔ کن پٹی سے مانگ نکالتا ہے اور بچے کھچے سر پاٹے کو موم لگا کر بائیں سے دائیں کن پٹی کی طرف جما دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور بھر بگلے کی طرح آنکھیں بند کر لیتا ہے، گویا سب ٹھیک ہے ۔

خدا جانے، دنیا کے تمام گنجوں کو کامپلیکس کیوں ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ کوئی قراقولی پہنتا ہے، کوئی فلیٹ، کوئی پی کیپ اور کوئی وگ لگا کر اپنی انا کو تسکین بخشتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

خدا کی قسم ۔ ۔ ۔ مجھے تو اصلی گنجے بے حد معتبر لگتے ہیں ۔

ویسے امجد بے حد نفیس آدمی ہے ۔

دل کھول کر ہنستا ہے ۔ دل کھول کر مذاق کرتا ہے اور اپنے ہم عصروں کو ہوٹ کرنے میں بھی پوری مہارت رکھتا ہے ۔

لیکن جو لوگ قابلِ احترام ہیں ان سے با ادب با ملاحظہ ہوشیار

رہتا ہے۔

پاکستان کا نمبر ون لطیفہ باز ہے۔ گرانڈ ٹرنک روڈ پر ڈال دو۔ شاہراہ سوری ختم ہو جائے گی، امجد کے لطیفے ختم نہیں ہوں گے .... ہنستا رہے گا، ہنساتا رہے گا....!

جیب آپ کی ہو، جیب بھی آپ کی ہو تو سفر کے لیے بہتر ساتھی ہے!

وہ استاد ہے بچوں کو پڑھاتا ہے۔ بے حد دل چاہتا ہے۔ کسی دن اسٹوڈنٹ بن کر اس کی کلاس میں جا بیٹھوں.... دیکھوں وہ پڑھاتا کیسے ہے؟

مَیں نے تو اس کی صرف ایک ہی شکل دیکھی ہے۔ محفل میں بیٹھا ہو تو جانِ محفل وہی ہوتا ہے....

کلاس روم میں محترم بنے رہنا اس کی شخصیت کا کیسا المیہ ہو گا...؟

سنجیدگی کا یہ عذاب وہ تین چار گھنٹے کیسے برداشت کرتا ہو گا....؟

اس طرح کے دو استاد ہمارے محکمہ تعلیم میں اور بھی ہیں۔ دلدار پرویز بھٹی اور مشکور حسین یاد....!

ان تینوں کا المیہ ملتا جلتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان تینوں کے نام تین حرفوں سے مکمل ہوتے ہیں۔ ان تینوں کے تینوں حرف بڑے رومانٹک ہیں اور ان کا ساؤنڈ ایفکٹ کانوں کو بھلا لگتا ہے....

اگر یہ تینوں جینٹس قسم کی چیزیں نہ ہوتیں اور تینوں میرے دوست نہ ہوتے تو یہ بڑا اچھا موقعہ تھا کہ تین تین حرفوں کے حوالے سے تینوں پہ تین حرف کا محاورہ فٹ کرتا۔

بہر کیف تینوں قہقہہ بار شخصیتیں ہیں.... ویسے میرا مشاہدہ ہے جو لوگ قہقہوں کے ساتھ بازار میں نکلتے ہیں ان کے گھروں میں بہت گھٹن ہوتی ہے۔

مَیں نے امجد کا گھر نہیں دیکھا ... خدا کرے اس کا گھر بھی قہقہہ زار ہو۔
عطاء الحق قاسمی کی صحت کا راز امجد کے قہقہے ہیں
ان دوستوں کے لیے لمحہ فکریہ۔
جو عطاء الحق قاسمی کو بے یار و مدد گار دیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں میں
پھوٹ ڈال دو ... "عطا" بلک بلک کر اسلام آباد پہنچے گا، لیلیٰ کی تلاش میں۔
کہتے ہیں ... ہر بات کو لطیفے میں لینا اچھی صحت کی نشانی نہیں ہوتی۔
لیکن ہمارا دوست امجد اسلام امجد اس بات کو غلط ثابت کرتا ہے۔
اس کی صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلکہ اس کا کہنا ہے کہ لطیفہ گوئی
دوسروں کی صحت کے لیے بھی ناگزیر ہے اور یہ کہ۔
میرا سماجی رتبہ بڑھانے میں میری شاعری اور ڈرامے سے زیادہ میری
لطیفہ بازی کا ہاتھ ہے ...
وہ کہتا ہے ... "فلم کو چھوڑئیے کہ وہاں مسخرے اچھلتے کودتے ہیں۔
انٹلیکچوئل سیکٹر پر تو مکمل میرا قبضہ ہے ... دلدار پرویز بھٹی کا بھی اس
سلسلے میں نام لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ میرے مقابلے میں قدرے دلگیر ہے!"
ویسے اچھے لوگوں کا کہنا ہے ... "امجد اچھا شاعر ہے"
لیکن امجد لطیفہ بازی کے بعد، ڈرامے کے ذریعے اپنی پہچان کرانے
کو ترجیح دیتا ہے ... بلکہ کسی حد تک اِتراتا ہے کہ "وارث" اور "دہلیز"
کا مصنف ہے ...!
حالانکہ کروڑوں روپے کمانے والی فلموں "مولا جٹ" اور "یکے والی"
کے مصنفوں کو آج تک کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔
"وارث" اور "دہلیز" بھی انہی فلموں کی طرح فارمولا ڈرامے ہیں ...
مَیں نے کسی محفل میں کہا تھا ...
"جس ملک میں مولا جٹ، جیسی فلمیں ایک کروڑ روپے سے زیادہ بزنس

کر جاتی ہیں اور "وارث" جیسے ڈراموں کو شہکار سمجھا جاتا ہے۔ اس ملک کا
خدا حافظ ہے اور ایسی قوم کا برین واشنگ کرنا چاہیئے۔۔۔۔!
میرا خیال ہے ۔۔۔ امجد کو "یا نصیب کلینک" جیسے ڈرامے پر فخر کرنا
چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ اوریجنل ہو۔۔۔! کیونکہ امجد کو کسی حد تک ڈنڈی مارنے
کا چسکا پڑ چکا ہے۔
اس کی ایک دھاندلی کا تو مجھے بھی علم ہے۔۔۔ ایک عربی ڈرامہ جو
امجد کے ٹائٹل سے ٹی وی پر دکھایا جا چکا ہے۔ خود امجد کے قلم کا ترجمہ میں
پڑھ چکا ہوں۔۔۔ یہ ڈرامہ پشاور میں تاج سعید نے مجھے امجد کو پہنچانے
کے لیے دیا۔ تب اصل عرب مصنف کا نام بھی اس پر درج تھا۔۔۔!
اور پھر "دہلیز" یا "وارث" کے کرداروں اور کرداروں کے ناموں تک
اپنانے کے جو الزامات "نوائے وقت" میں لگائے گئے تھے۔ ان کی ابھی تک
تردید نہیں ہوئی۔
اگر امجد شاعر ہونے کے بجائے واقعی ڈرامہ نگار ہونے پر فخر کرنے
کی نیت رکھتا ہے تو بسم اللہ۔۔۔! قوم منتظر ہے۔
لیکن احمقانہ اکثریت کے تالی بجانے پر اترانا ضروری ہے تو پھر فلم کا رستہ
صاف ہے اور وہاں ان کی ضرورت بھی ہے، کیونکہ دو عدد ہیرو، دو عدد ہیروئن
دو عدد مائیں، دو عدد باپ، دو عدد ویلین، دو عدد حواری اور دس عدد
بڑکیں فلم والوں کی عین ضرورت ہیں۔۔۔۔
اور پھر چھوٹی سکرین سے بڑی سکرین زیادہ جاذب نظر ہوتی ہے۔
یہی نہیں۔۔۔ ٹی وی کے مقابلے میں فلم والے جیب خرچ بھی دس
بارہ گنا زیادہ دیتے ہیں۔۔۔!

جادُو گر

کرنل غُلام سرور

دو چار ملاقاتوں کے بعد جو شخص سیدھا آپ کے دل میں جا بیٹھے اُسے تو جادُو گر کہنا ہی پڑے گا۔

میری طرح کرنل غلام سرور بھی غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور اس پر اُسے مار نہیں ہے وہ اپنے مدرس باپ کا ذکر اس والہانہ پن سے کرتا ہے کہ غریبی ایک قدر بن کر سامنے آجاتی ہے۔

یہی نہیں — بلکہ انسان محسوس کرتا ہے کہ جس گھر میں دیانت، شرافت اور محبت لہو بن کر شریانوں میں دوڑنے لگ جائے، وہاں غلام سرور جیسے سپوت پیدا نہ ہوں گے تو اور کیا ہو گا — ؟

ہماری دوسری قدر مشترک کہ ہم دونوں فوجی ہیں، میں سابق فوجی وہ حاضر فوجی، لوگوں کے متعلق ایک بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے کردار میں پیچ نہیں ہوتا، ٹیڑھ نہیں ہوتی، سیدھے ستھرے لوگ ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں نہیں دیکھتے، بس ناک کی سیدھ چلتے ہیں۔

جنرل شفیق الرحمٰن کو دیکھئے، کرنل محمد خاں کو دیکھئے، میجر منیر جعفری کو دیکھئے، جی چاہتا ہے بس ان سے پیار کئے جاؤ — !

مجھے کرنل صدیق سالک بھی اس قبیلے سے لگتے ہیں۔ غلام سرور بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہیں کہ محبوب کے سوا کوئی اور لفظ اس کی

شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتا!

کرنل سے پہلی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی ــ درمیانے قد کا سانولا سا غیر مؤثر آدمی، لیکن تعارف ہوا، بات ہوئی، تو سراپا سپردگی، وہ اچک کر دل پر ہاتھ رکھتا ہے اور پھر دل کی ہر دھڑکن میں سمو جاتا ہے۔!

ایسے میں اس کے ہونٹوں پر پھُل جھڑی کے داغ چنبیلی کی کلیوں میں منتقل ہو جاتے ہیں، تب محسوس ہوتا ہے کہ اصل حسن باطن کا حسن ہوتا ہے۔

غلام سرور انتہائی محنتی آدمی ہے، بے حد فعال، متحرک، وہ ہر لمحے ہر آن سفر میں ہوتا ہے۔

خدا سے لگن، اولاد سے پیار، دوستوں سے عشق، عام آدمی سے رواداری، فرض منصبی کا احساس اور وطن سے محبت، کرنل کا سفر، انہی سچے اور کھرے جذبوں سے عبارت ہے۔

اور اس سب پر سوا، ادب ـ؟

وہ ادب کے نووارد کھلاڑی ہیں، مگر نوآموز نہیں اس کی تحریریں بلا کی سلاست ہے اور بے حد پختگی۔

دو چار سال پہلے تک لوگ یہ نام کم کم جانتے تھے مگر آج صورت حال دوسری ہے۔ کرنل نے اچھے اچھوں کو چونکا دیا ہے۔

یہ سارے فوجی ایسے ہی ہوتے ہیں، محمد خاں ہوں یا غلام سرور، اچانک میدان میں اترتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر میدان سر کر لیتے ہیں۔

کرنل کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ وہ اُردو، انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتا ہے، بڑی بات، سادہ لفظوں میں کہنا بہت مشکل فن سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگ شعوری کوشش سے اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن کرنل سرور کی بات ہی اور ہے وہ بہت سلیس

زبان لکھتا ہے بہت سادہ، مگر اس رواداری میں چونکا دینے والی بات کہنے کا ہنر اسے نیچر سے ودیعت ہوا ہے۔
شہر کی مکھی کا پر اسیس اور کرنل غلام سرور کی تحریر کا گداز دونوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔
کرنل کی زندگی کا تار پود بھی کچھ اسی طرح کا بنا گیا ہے: تدبیر اور صرف تدبیر، محنت اور صرف محنت، آگے بڑھنے کی خواہش، کچھ کر گزرنے کی آرزو۔
میٹرک کیا تو ایک معمولی مدرس کی حیثیت سے کارگاہ حیات میں اترا، ایف اے کس طرح کیا، بی اے کس طرح کیا، یہ جوئے شیر لانے سے کم مسئلہ نہ تھا۔
عام دیہاتی لڑکوں کی طرح وقت سے پہلے شادی بھی کر ڈالی، ابھی خود عزیزم تھا کہ محترم بن گیا، ابھی خود بیٹا تھا کہ بیٹی کا باپ بن گیا۔
انگلش ٹیچر بنا، سیکنڈ ماسٹر بنا اور پھر چپکے سے بی ایڈ کر لیا۔ نچلا نہ بیٹھنا اور کچھ کرتے رہنا، اس کی جبلت۔
علم کی تشنگی، ورق ورق چکالی، نیست سے ہست کی طرف سفر، لوگ خشخاش اور بادام رگڑ رگڑ کر قوت بڑھاتے ہیں، کرنل نے کتابوں کی سیاہیاں چاٹ چاٹ کر توانائی بڑھائی ہے — سیاہی سے اس کا رنگ سانولا ہو گیا ہے۔ روشنائی سے اس کا ذہن روشن ہو گیا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ سرگوشی میں خبر ملتی ہے، ماسٹر نے ایم اے کر لیا ہے۔ پٹڑی بدل لیتی ہے۔ ماسٹر ماسٹر نہیں رہتا پروفیسر بن جاتا ہے۔ کہیں تو رکو، مگر یہ اس کی عادت نہیں، یہ اس کی فطرت نہیں، جسم میں رواں دواں خون کی طرح سفر اور سفر، کہ یہی ادائے زیست، یہی جواز حیات۔
علم کے حصول میں قناعت پسندی کے کیا معنی، جہاں سے ملے سمیٹ

لو۔ جہاں سے جھولیاں بھریں بھر لو۔ یہی کرتا رہا غلام سرور، تو کیوں نہ بنتا لفٹیننٹ ۔۔! پرفیسری چھوڑ دی، وردی پہن لی، مگر پڑھانا نہ چھوڑا، تعلیم و تدریس گھٹی میں، نحو و صرف ورثے میں،

کالج چھوڑا، طلبہ نہ چھوڑے ۔۔

کپتان بنا مگر کتاب سے ناتہ نہ ٹوٹا، ناتہ ٹوٹتا تو ایک اور ایم اے کیونکر کرتا ۔۔!

علم کے لیے چین جانے کی خواہش ہو تو آدمی پہنچ ہی جاتا ہے ۔۔ اس نے جو سوچا، ہو گیا ۔ جذب دروں ہو تو چین کیا، آدمی دیوار چین سے بھی آگے نکل جاتا ہے ۔۔ یہ تو خیر سب کچھ ہے ہی، کرنل کا ایک اور کمال ۔۔ شاباش سے بچ نکلنے کا نسخہ، تحسین و آفریں سے محفوظ رہنے کا گر، نظر نہ لگ جائے آبگینوں کو!

کرنل نے دو ایم اے کیے، دونوں دفعہ صرف ایک نمبر کی کمی سے فرسٹ ڈویژن رہ گئی ۔۔!

ہے کوئی مائی کا لال، ایسا مستقل مزاج، ایسا روایت پسند، ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے والا، پکا سپاہی، مارکس میں ایجوکیشن کا آدمی، مگر پول پل نئے انداز میں "گل زیٹری" کا خوگر ۔۔

نہ ایک نمبر کم، نہ ایک نمبر زیادہ، ۔ شاباش پہنیڈ ولڑکے، کہ اب وہ کرنل ہے، ایک با اختیار اور معزز افسر۔

ایک ایسی دختر نیک اختر کا باپ، جس نے بی اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور روایت شکنی کے الزام میں باپ کی لاڈلی بنی ۔۔

وہ کیا کہتے ہیں، خلیج فارس کے لوگ ؎

این ہمہ خانہ آفتاب است

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

عبداللہ قریشی

ادبی انسائیکلوپیڈیا
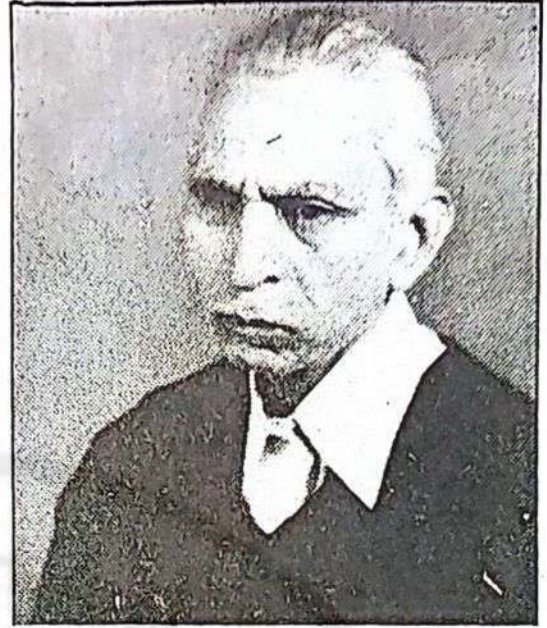
اُجلا اُجلا گندمی رنگ، بڑی بڑی شفاف آنکھیں، میانہ قد، ہلکا پھلکا جسم، شلوار قمیض پہننے والا عبداللہ قریشی بات کرتا ہے تو میکانکی انداز میں ان کے ہاتھ بھی زبان کا ساتھ دیتے ہیں، بلکہ ان کے ہاتھوں کی حرکت کی زبان زیادہ فصیح اور فیصلہ کن ہوتی ہے، آنکھوں کی چمک، ہاتھوں کی حرکت اور الفاظ کے بہاؤ کا سُر تال اور ردم دیدنی اور شنیدنی ہوتا ہے۔

۱۹۰۵ء میں پیدا ہونے والا عبداللہ قریشی آج بھی جوان ہے۔ سفید بالوں پہ نہ جائیے کہ یہ تو ایک تکنیکی معاملہ ہے اور ایک لمبے سفر کی کہانی، ورنہ جسمانی طور پہ وہ اب بھی جوانوں کی طرح سمارٹ اور ذہنی طور پہ نوجوانوں سے زیادہ تیز اور تازہ!

قریشی صاحب ایک مستند تاریخ ہے یا یوں کہیئے پاک و ہند کی پاکٹ بک ادبی انسائیکلوپیڈیا، جب چاہیں، جہاں چاہیں جیب میں ہاتھ ڈالیں اور اپنی مشکل آسان کرلیں۔

روایت ہے چین کے ایک بادشاہ نے چین کی ساری تاریخ جلا ڈالی۔ اس نے حکم دیا چین کی تاریخ اسی کے عہد سے شروع کی جائے۔ یہ بادشاہ مرگیا تو چین میں ایک ایسا آدمی مل گیا جسے ماضی کی پوری تاریخ یاد تھی چنانچہ اس نے دوبارہ تاریخ لکھ ڈالی۔

عبداللہ قریشی بھی ایک ایسا ہی درویش ہے۔ اگر پاک و ہند کی ادبی تاریخ نیست و نابود ہو جائے تو یہ درویش اپنی یاداشت کے زور سے پوری تاریخ پھر سے مرتب کرے گا۔

جن لوگوں نے قریشی صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہونگے کہ ان کے ظاہر و باطن میں کوئی الجھن نہیں ہے۔

سمت سفر معلوم اور مقصد سفر واضح، ان کے ادبی رویے میں صاف دل اور کھلے ذہن کی سلامت روی ہے، جیسے ان کے دانتوں کی سلامت اڑتیس برس ریلوے میں ملازمت کی۔ ریلوے اور پولیس دو ایسے محکمے ہیں کہ دو سال میں حلیہ بگڑ جاتا ہے اور انسان کی فطرت کی ساری لچک ختم ہو جاتی ہے۔ مگر قریشی صاحب ایسے سخت جان نکلے کہ شیشے میں بال نہ آیا اور ریلوے جیسا محکمہ بھی ان کی فطرت کی نزاکت اور لطافت کو ختم نہ کر سکا۔

دورانِ ملازمت لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن جب جاہ اور نمود و نمائش کی ہوس سے یکسر خالی، بے غرضی کا یہ عالم تھا کہ بغل میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ہم سفر کو علم نہیں تھا کہ اس کا ہم پیشہ عبداللہ قریشی کا ادب میں کیا مقام ہے؟

اس بارے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

علمی انہماک کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ نمود و نمائش سے بے نیاز ہوتا ہے۔ ایسے اصحاب کی نظریں ہمیشہ ضروری علمی کاموں کے سرانجام پر جمی رہتی ہیں اور انہیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ دنیا ان کی خدمات پر تحسین و ستائش کے پھول نثار کرتی ہے یا نہیں کرتی اور خدمات کی داد ملتی ہے یا نہیں ملتی۔ عبداللہ قریشی اہل علم کے اس شیوے اور اس خصوصیت کی قابلِ قدر مثال ہیں۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ

اہم علمی کاموں میں بسر کیا لیکن دنیا سے روشناسی کی الجھنوں میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔
وہ ان گنت کتابوں کے مصنف ہیں۔ اقبال پر انھوں نے بے تحاشا کام کیا ہے اس کا اعتراف خود محترم جاوید اقبال نے بھی کیا ہے۔
یہ کیا کم اعزاز ہے۔ مسلسل سات سال تک رسالہ "نقوش" کے معاون رہے اس عرصے میں "نقوش" کے ان گنت خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ ان نمبروں میں مدیر نقوش محمد طفیل کی کاوشوں کے ساتھ ورق ورق پر عبداللہ قریشی کا خون رچا بسا ہوا ہے۔
یہی نہیں مولانا صلاح الدین احمد کے انتقال کے بعد سات آٹھ برس تک "ادبی دنیا" کی ادارت کی۔ ادبی دنیا کا کشمیر نمبر عبداللہ قریشی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اس نمبر کو آزاد کشمیر کے سکولوں اور کالجوں کے لیے منظور کیا گیا اور نہ صرف ان کاوشوں کا اعتراف کیا گیا بلکہ گرانقدر انعام سے بھی نوازا گیا۔
جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے کسی کی ایک آدھ کتاب چھپی تو بزعم خود علامہ بن بیٹھے۔ پھر ماضی و حال میں ان سا دوسرا نہیں ہوتا۔ بلکہ ببانگ دہل پیش گوئی کرتے ہیں کہ مستقبل میں بھی ان سا دوسرا نہیں آئے گا۔
آج کا ادیب انجمن ستائش باہمی کا خمیر ہے۔ اس کے فیصلے ماضی اور مستقبل پر محیط ہیں وہ حرف مدعا کم کہتا ہے، تعلقات عامہ پر یقین زیادہ رکھتا ہے
وہ ادب کو کم تخلیق کرتا ہے۔ جتھہ بندی میں پیش پیش ہوتا ہے اور ایک عبداللہ قریشی ہے، گنج ادب سے سینہ معمور، مگر سمٹے سمٹائے سے، ایک گوشے میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے، نہ بلند بانگ دعاوی، نہ داد و سند کے چرچے، یہ درویش طبع آدمی عرض تمنا سے بالکل عاری ہے۔
اپنے سفید بالوں کی طرح، جس میں کوئی مانگ نہیں ہوتی۔ جیسے وہ

کنگھی کر کے پیچھے کی طرف جما دیتا ہے۔ اس نے ہر خواہش کو کوسوں پیچھے دھکیل دیا ہے اور اس کا سیدھا سادہ جیون ہر طلب اور ہر مانگ سے بے نیاز ہے۔

سچ تو ہے اس نے ادب میں جتنا کام کیا ہے اسے ایک پلڑے میں ڈال دو اور ہم جیسے دس بیس ادیبوں کو دوسرے پلڑے میں پھر بھی عبداللہ قریشی کا پلڑا بھاری ہوگا۔
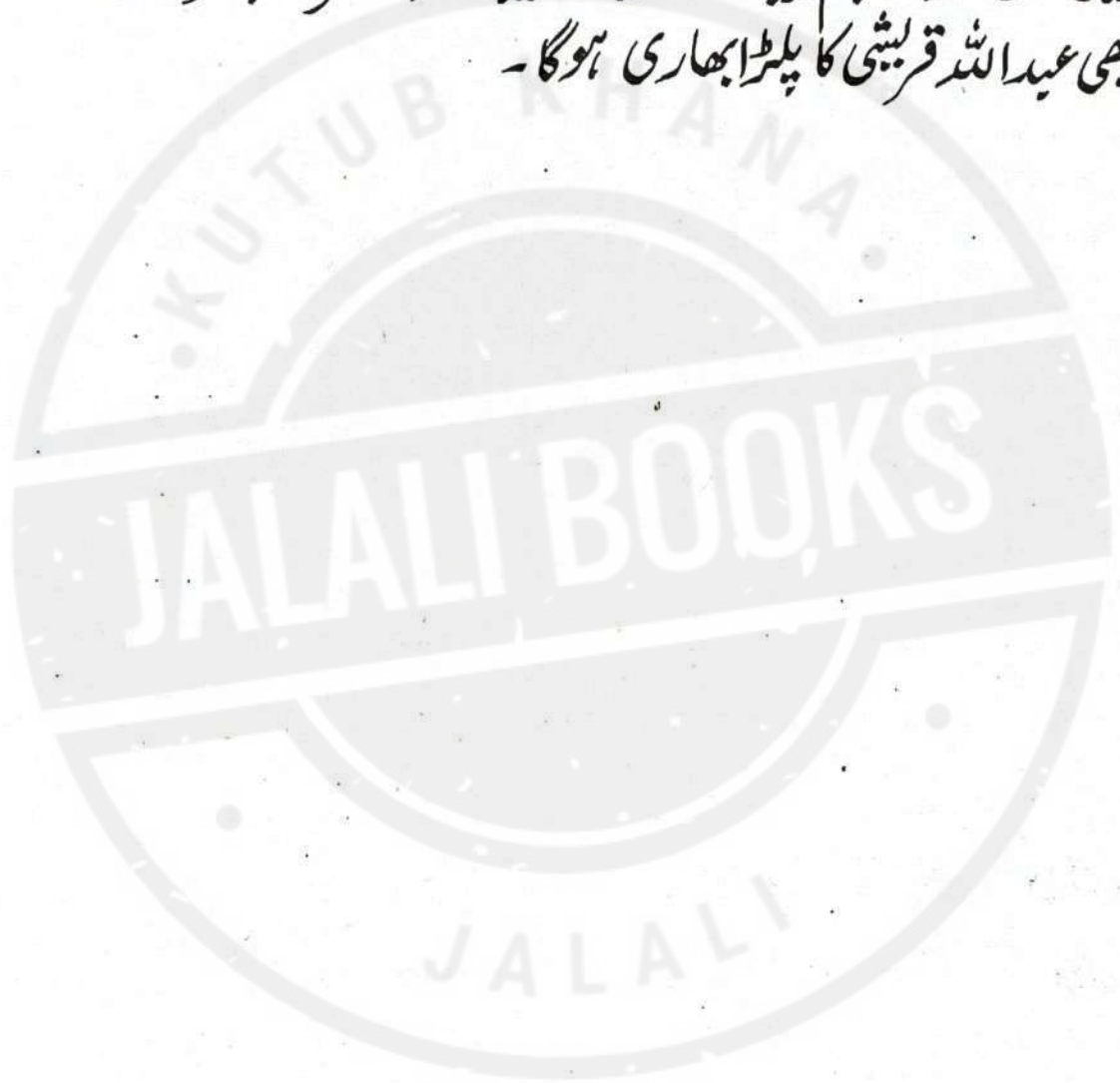
عوامی شاعر

حبیب جالب

شاعر تو وہ ہے ہی اچھا، پھر منقار زیر پر کیسے؟ اوپر سے سیاست کی چاٹ یعنی کریلا اور نیم چڑھا! گوشۂ عافیت راس آئے تو کیسے؟

وہ مرغ بادِ نما کی فطرت نہیں رکھتا اور اس تکنیکی صدی میں بھی احساس کے راج پاٹ کے خواب دیکھتا ہے ایسا بدبخت حبیب جالب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے!

وہ سچ کا داعی بنتا ہے ....

بڑا مزاقیہ ہے .. فریب کی بات کرتا کہ مارکیٹ میں بھاؤ لگتا، جھوٹ جیسے چال ڈھال کی طرف دھیان دیتا تو کچھ پلے بھی پڑتا۔ بیسویں صدی اور سچ .. واہ! جالب اصولوں کے لیے جیتا ہے جیل یاترا کا بھی شوقین ہے.. حالانکہ جیل میں چور جاتے ہیں، یا ڈاکو، قاتل اور لیڈر۔

حبیب جالب نہ چور ہے نہ ڈاکو اور نہ قاتل ... لیڈر ہونے میں بھی اس لیے شک ہے کہ حویلی رکھتا ہے نہ اصطبل، تو پھر ..؟

حبیب جالب کو کون سمجھائے کہ بھلے آدمی تم جو نہ شہزادے ہو، نہ صاحب زادے اور نہ اخوند زادے، تم تو رئیس زادے بھی نہیں ہو پھر کس بات پہ سیاست کرتے ہو ....

ایوانِ اقتدار جالب جیسے آوارہ ملنگ شاعروں کے لیے نہیں ہوتے چھری اور چمچے کی تہذیب سے وہ ناآشنا، انگریزی سکولوں میں وہ نہیں

پڑھا، آکسن لہجہ نہیں رکھتا تو فارن ڈیلیگیٹ سے کس طرح ڈیل کرے گا۔
خارجہ معاملات کے لیے سوجھ بوجھ کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی آکسن
لہجے کی ہوتی ہے۔

حبیب جالب فطری شاعر ہے، صاحب کتاب ہے بلکہ صاحب
کتب ہے۔ مگر اُردو بولتا ہے تو فوراً پکڑا جاتا ہے کہ پنجابی ہے ایک تو
آکسن لہجے کی کمی اس پر دھڑ پنجابی، اور اس پر ایوانِ اقتدار کے خواب معلوم
ہوتا ہے جالب 'تاریخ' کا طالب علم نہیں۔

ظاہر ہے نہیں ہے، ورنہ کبھی سچ نہ بولتا کبھی اصولوں کا پرچار نہ کرتا۔
اور نہ کبھی جیل کی ہوا کھاتا۔ میں نے کہا نا! حبیب جالب 'تاریخ' کا طالب علم
نہیں، نہ اس نے چانکیہ کو پڑھا اور نہ میکاولی کو اور چلے سیاست کرنے!

نہ بابا... جالب کبھی وزیر نہیں بن سکتا، جالب کے طبقے کے لوگوں
کو وزارت راس نہیں آتی، کبھی بھول چوک سے قلمدان وزارت مل بھی
گیا تو جو حال "رامے" کا ہوا وہی حال اس کا بھی ہوگا۔

پھر نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ گا!

بے شک جالب عوامی شاعر ہے مگر ایک کی ذہنیت کو نہیں جانتا"
بفرض محال وزیر بن جائے گا تو کیا کرے گا، لاکھ دو لاکھ کا ہیر پھیر... کہ یہی
اس کی اوقات ہے وہ اپنے عالی ظرف عوام کو نہیں جانتا اتنی حقیر بے ایمانی
پر تو وہ ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے۔

یعنی ایسا ٹٹ پونجیا وزیر لاکھ دو لاکھ پہ اکتفا کرنے والا، عوام اس
کی عظمت اس وقت تسلیم کرتے جب جالب دو چار کروڑ، دو چار ارب
کا غبن کرتا، اور اخبارات شہ سرخیاں لگاتے۔ ایشیا کا عظیم ترین فراڈ...!

پھر شاید صحیح امیج بنتا، صحیح مقام کیونکہ قبل ازیں ہم لوگ ایشیا کی عظیم
مل، عظیم بند، ایشیا کا عظیم کھلاڑی اور ایشیا کا خوبصورت وزیر اعظم جیسے

نعروں کے عادی ہو چکے ہیں۔

ایشیا کے عظیم فراڈ سے جالب تاریخ کا سنہری باب بن جاتا، امر ہو جاتا، پھر اسے نہ شاعری کی امنگ ہوتی نہ سچائی کی آرزو، نہ اصولوں کی ضرورت اور نہ شہرت کی خاطر لاکھوں کے مجمع کی تلاش!

اور فرض کرو... جالب کو لیڈر تسلیم کر لیا جائے، ایسا لیڈر جو اصولوں کی جنگ لڑتا ہو تو لوگ نہیں مانیں گے کیونکہ اس طرح کے سچے لیڈر اول تو ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتے... پیدا ہوتے ہیں تو کھوٹے سکے کی طرح چلتے نہیں۔

لچک بے حد ضروری چیز ہے طوفان آئے تو گھاس کی طرح لیٹ جاؤ، طوفان گزر جائے تو پھر سے سر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔

انقلاب آئے تو چپ رہو، انقلاب کامیاب ہو جائے تو انقلابیوں کے نعرے میں شامل ہو جاؤ۔

یوں زندگی آسان ہو جاتی ہے...

اور اگر اصولوں کا راگ الاپتے رہے تو دوست ایک ایک کر کے چھٹ جائیں گے۔ ٹھیک بھی تو ہے، ایسے لیڈر سے دوستی کا فائدہ، کہ افتاد پڑے تو اصولوں کی مالا جپتا رہے اور دوست کی دستگیری پر یوں توجہ نہ دے کہ اس کے خود ساختہ آدرشوں کی نفی ہوتی ہے۔

ویسے جملہ معترضہ سہی، جالب کے بہت سے دوست حیران ہیں کہ وہ ہے تو شاعر مگر ایسا اٹل کیونکر بن گیا...؟ چپ چاپ جیل چلا جاتا ہے۔

بظاہر اعتراض کہ اچھا باپ نہیں، اچھا شوہر نہیں، مگر اندرون خانہ مرعوب، اور کسی حد خوف زدہ بھی کہ جی دار آدمی ہے سچ کے کولھو میں جتا ہوا ہے اور مسلسل سفر کر رہا ہے۔ کم از کم شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایسے استقلال کا مظاہرہ مثالی ہے۔

مسلسل تیس برس سے کسی حکومت سے نہیں ڈرا، ہر طرم خان سے آنکھ ملا کر بات کرتا ہے، تو پھر ایسے چٹان کو سلام کرنے میں کیا حرج ہے؟

تو یہ لوگ حبیب جالب کو سلام کرتے ہیں یہ نفسیاتی سلام ہے ویسے موقع کی تلاش میں ہیں کہ اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آئے تو جی بھر کر تضحیک کریں اور ممکن ہو تو یہ شوشہ چھوڑیں کہ سرمایہ داروں کا پٹھو ہے، سرخ ریچھ کا ایجنٹ ہے یا انکل سام کا پروردہ ہے۔

مگر جالب ایسا ستم ظریف ہے کہ موقع ہی نہیں دیتا، اپنے رویے سے سب کو جھٹلا دیتا ہے، جیب میں سگریٹ کے لیے پیسہ، نہ ڈھنگ کے کپڑے کسی کو چائے پلانے تک کا حوصلہ نہیں، مگر پھر بھی پکڑائی نہیں دیتا۔

حبیب جالب کو یہ سنگ دلی زیب نہیں دیتی کہ دوست احباب تڑپیں اور وہ فاقہ مستی میں بھی ان کے ہاتھ نہ آئے۔

پچھلے دنوں فتح علی خان انتقال کر گیا، فتح علی خان میرا دوست تھا پاکستان کا بہت بڑا فن کار، حبیب جالب جتنا شاعر ہے فتح علی خان اس سے دس گنا بڑا استار نواز تھا، اس کے گھر میں جب چولہا نہیں جلتا تھا تو وہ ستار سے ایسے سُر لگاتا تھا کہ بچے بھوک بھول جاتے تھے۔

یہ بے مثال فن کار بے حد کسمپرسی میں مرا وہ بے حد تھوڑی تنخواہ پر زندگی کی لاش کھینچ رہا تھا۔ جالب کی تو کوئی تنخواہ بھی نہیں پھر بھی جئے جا رہا ہے۔ یہ بڑی سخت جان فیملی ہے، نشۂ ہنر پر زندہ رہنے والی، شاید بہت سے لوگوں کو معلوم بھی نہیں کہ مرحوم فتح علی خان حبیب جالب کے بھائی تھے۔

❀❀
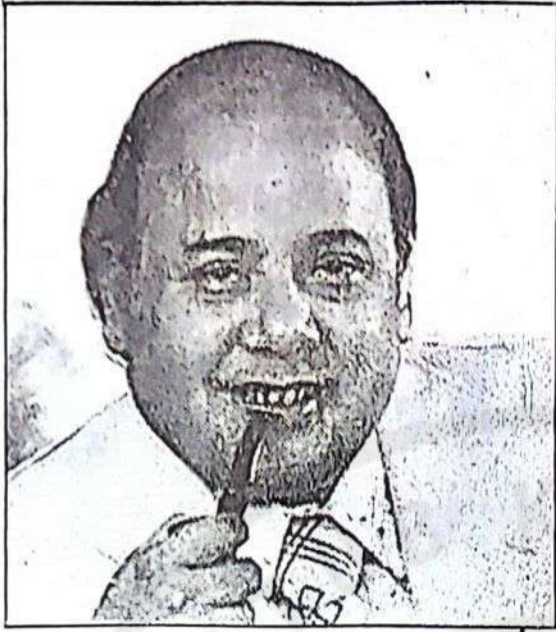
شباب کیرانوی

شاعر، ناول نگار، فلم نگار، فلم ساز، فلم تقسیم کار اور فلم ڈائریکٹر......
مَیں شباب کیرانوی کو لگ بھگ پچیس برس سے جانتا ہوں جب فلمی رسالے "ڈائریکٹر" کا ایڈیٹر ہوتا تھا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتا تھا اور اب، جب وہ ایک فلم سٹوڈیو کا مالک ہے۔ اَن گنت فلموں کا پروڈیوسر، عالیشان کوٹھیاں اور ایک بڑے تقسیم کار ادارے کا کرتا دھرتا، لاکھوں کروڑوں میں کھیلتا ہے۔ لیکن اس کے رویے میں مو بھر فرق نہیں... نہ دولت کا گھمنڈ نہ احساسِ برتری اور نہ نو دولتیوں والا چھچھورا پن! وہ تب بھی سیدھا سادا ہنستا مسکراتا متین آدمی تھا اور وہ اب بھی اسی طرح مخلص، شگفتہ اور محترم آدمی ہے......

وہ مکمل طور پر سلف میڈ آدمی ہے...... بے حد تھوڑے سرمائے سے، بلکہ محض ہاتھ پاؤں سے اس نے فلم سازی کا آغاز کیا۔ تیسرے درجے کے ہیرو اور چوتھے درجے کی ایک ڈانسر کو ہیروئن لے کر فلم شروع کی، فلم مکمل ہوئی، ریلیز ہوئی اور بُری طرح فلاپ ہو گئی۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا، بھاگ جاتا اور اس کام سے توبہ کر لیتا، لیکن شباب نے حیرت انگیز

خوداعتمادی اور استقلال سے کام لیا..... اس نے دوسری فلم کا منصوبہ بنایا.... یہ فلم بھی مکمل ہوئی، فلاپ ہوگئی..... لیکن شباب کا حوصلہ نہ ٹوٹا اس کا ارادہ متزلزل نہ ہوا۔ اس کی یقین افروزی قائم تھی، یہ دونوں فلمیں "جلن" اور "ٹھنڈی سڑک" کے ناموں سے بنی تھیں، فلم کے فیل ہوجانے سے روپیہ تو ضائع ہوتا ہی ہے۔ لیکن ایک چیز ہوتی ہے "گڈ ول" فلم انڈسٹری میں "گڈ ول" روپے سے زیادہ قیمتی اور اہم ہوتی ہے۔ ساکھ گئی تو سب کچھ گیا..... شباب کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

البتہ ایک چیز باقی تھی..... نیت.....! بس یہ نیت ہی تھی کہ شباب کو شباب کیرانوی بنا گئی..... سب کچھ ہارنے کے بعد بھی عزم و یقین کی دولت اس کے پاس تھی۔ چل ول اس کی سرشت میں نہ تھی بے ایمانی اور چالاکی اس کی شخصیت کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ البتہ وہ سیکھ گیا تھا فلم میکنگ کے گر، اونچ نیچ اور لین دین کے طریقے اور بعد از نقصان کی شائستگی برداشت اور تحمل.....! فلاپ فلموں کے تلخ تجربوں نے اسے صیقل کر دیا تھا اور اس پر نیک نیتی سوا.....! اس کی فلم "ثریا" کلک کر گئی..... یہ نکتہ آغاز تھا، شباب کی زندگی کی پہلی کامیابی تھی۔ طوطئ قسمت نے اسے پہچان لیا تھا..... روپیہ بارش کی طرح برس رہا تھا اور خوش بختی اس کے ماتھے کو بار بار چوم رہی تھی۔ مگر یہ شباب تھا اور شباب کا ظرف تھا کہ متزلزل نہ ہوا۔ اپنے آپ میں رہا، اپنے جامے میں رہا۔ اچانک ڈھیر ساری دولت آجانے سے لوگ بہک جاتے ہیں۔ بدل جاتے ہیں۔ ہماری انڈسٹری میں ایسا ہوتا آیا ہے، ہوتا رہے گا لیکن شباب اپنی جگہ قائم رہا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا..... نہ نعرہ لگایا نہ کپڑے پھاڑے اور نہ ہی ندیدوں کی طرح اس کی چال ڈھال میں فرق آیا۔ وہی سادگی، وہی متانت اور وہی احترام و شائستگی..... پہلے وہ محض جسمانی طور پر بھاری تھا اب وہ ذہنی اور قلبی طور پر بھی بھاری بھرکم ہوتا چلا گیا، وہ

فطرتاً عالی ظرف آدمی تھا۔ فلم کے لوگ جو کسی کو کم کم عزت دیتے ہیں شباب کو پورا احترام دیتے ہیں۔ فلم کے ایکٹر اور ایکٹرسیں جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، شباب کو اپنے سر پہ بٹھانے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔

جو ایکٹر اور ایکٹرسیں ایک ایک شفٹ یا آدھی شفٹ دے کر فلمسازوں پر احسان کرتے ہیں۔ شباب کو مسلسل بیس بیس دن کی شوٹنگ ڈیٹس دے کر خوش ہوتے ہیں۔ جو ایکٹر اور ایکٹرسیں دوسرے فلمسازوں سے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو لاکھ روپیہ وصول کر کے بھی ان سے خوش نہیں ہوتے وہ شباب کی فلم میں محض ایک لاکھ روپے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ دراصل شباب واحد پروڈیوسر ہے جو ایک لاکھ روپیہ ایک چیک اور قسط میں ادا کر دیتا ہے۔۔۔۔ شباب کہتا ہے "روپیہ کنوئیں کا پانی ہے۔ جتنا نکاس کرو گے پھر سے بھر جائے گا! شباب بخیل آدمی بھی نہیں ہے جیسا کماتا ہے ویسا خرچ بھی کرتا ہے۔ دوستوں سے بھی پہلو تہی نہیں کرتا بلکہ ان کی مدد کرتا ہے۔ پوری انڈسٹری میں شباب جیسا گڈ پے ماسٹر دوسرا نہیں ہے۔ میں نے آج تک کسی ایکٹر، کسی سنگر، کسی نغمہ نگار، کسی موسیقار اور کسی ورکر کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ شباب نے اس کا حق مارا ہے حالانکہ ہماری فلم انڈسٹری میں "حق مارنا" ایک اصول کی طرح جاری وساری سچائی ہے۔۔۔۔! جس طرح سمگلنگ آج کے دور میں ایک معزز پیشہ بن چکا ہے۔ اسی طرح "حق مارنا" بھی ایک معزز پیشہ ہے۔۔۔۔ شباب واحد آدمی ہے جو اس معزز پیشے میں ملوث نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں فلم میکنگ میں فلم ساز اور ہدایت کار میں جتنی صلاحیتیں ہونی چاہئیں وہ شباب کے علاوہ بھی کئی لوگوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں بلکہ کچھ اصحاب تو ذہانت اور ٹیکنیکل صلاحیتوں میں شباب سے بہتر بھی ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ نیک نیتی میں شباب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ

وہ شباب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں .... میرا خیال ہے، نری ذہانت بھی کوئی چیز نہیں ہوتی اور محض ٹیکنیکل ادراک بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خوبصورت زندگی اور کامیاب زندگی کے لیے اعتدال بے حد ضروری بنیاد ہوتی ہے۔ نمک کتنی اچھی چیز ہے۔ لیکن ہانڈی میں زیادہ پڑ جائے تو سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے .... تو کہا جا سکتا ہے کہ انتہا پسند لوگ وقت سے پہلے مر جاتے ہیں اور خوف زدہ لوگ بار بار مر کر جیتے ہیں.... کامیاب وہ ہے جو اعتدال برتتا ہے۔ شباب کیرانوی کی طرح کہ حوصلہ بھی ہے۔ ظرف بھی ہے، نیت بھی ہے اور کام تو خیر وہ کرتا ہی ہے !!
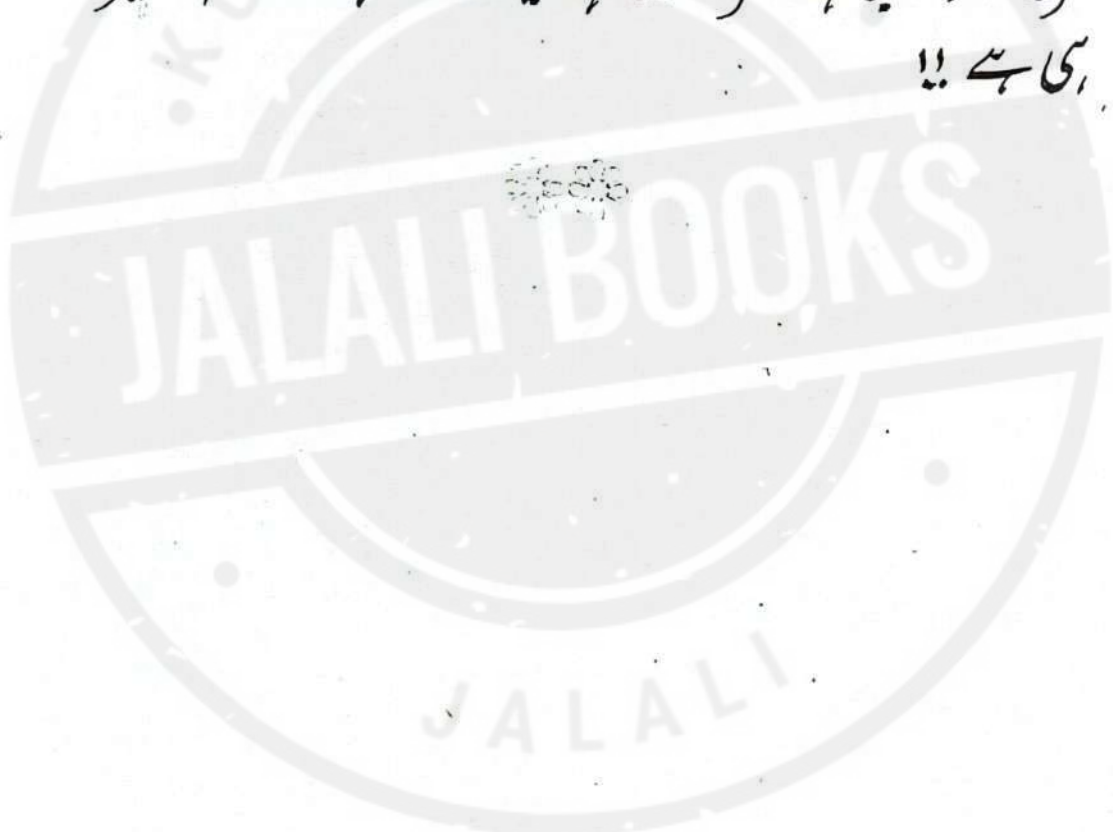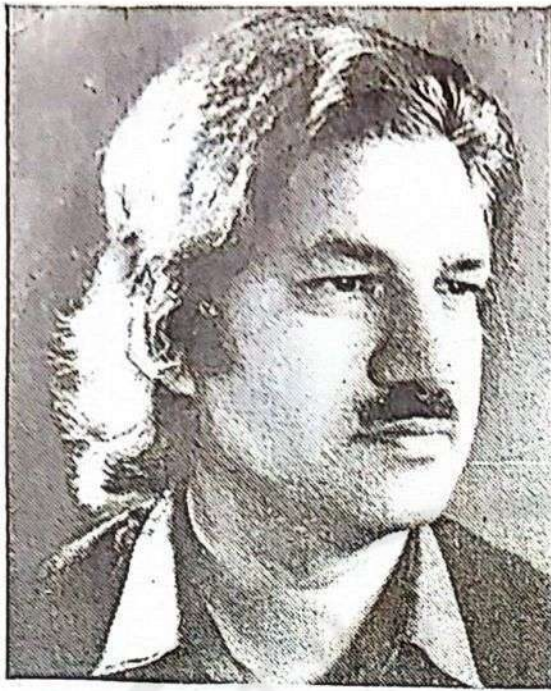
ناصر زیدی

نرم سا، ملائم سا، چکنا سا،
گورا سا، پیلا سا، گندم نما،
ٹھیک ٹھاک صحت مند۔۔۔!

جب مخلوق تخلیق ہو رہی تھی تو مردوں کی گنتی میں ایک آدھ کی کمی رہ گئی تھی چنانچہ صنف لطیف بنتے بنتے ادب لطیف کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔

ادب لطیف کا ایڈیٹر ہونا ناصر زیدی کا نکتۂ عروج اور ناصر زیدی کا ادب لطیف کا ایڈیٹر ہونا ادب لطیف کی زندگی کا نکتۂ زوال۔۔۔۔!

ناصر زیدی اگر ادبِ لطیف کا ایڈیٹر نہ بنتا تو شاید زندگی میں کوئی سماجی یا معاشی کامیابی حاصل کر بھی لیتا، وہ ادب کے علاوہ بھی کوئی کام کر سکتا تھا مگر ادب لطیف کی ایڈیٹری نے اس کا بیڑہ غرق کر دیا۔۔۔۔!

یہ اتفاق ہے یا حادثہ، بدقسمتی یا حالات کی ستم ظریفی۔۔۔۔ اس کے لیے ادب لطیف کی ادارت، تخت طاؤس پہ بیٹھنے سے کم سعادت نہ تھی۔۔۔

نہ ہمایوں ڈوبتا، نہ نظام سقہ بادشاہ بنتا، نہ چمڑے کا سکہ چلتا، اب بے چارہ ناصر زیدی کیا کرے۔۔۔۔؟

اپنے لیٹر پیڈ پہ سابق ایڈیٹر ادب لطیف نہ لکھے تو کیا کرے۔۔۔!؟

پدرم سلطان بود۔۔۔۔!

یہی اس کی پہچان ہے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔۔!!

تعلق نارواکی ایسی بدتر مثال شاید ہی اردو ادب میں ملے !

ویسے ناصر زیدی اچھا آدمی ہے ..... خوش رو، خوش ادا، خوش باش خوش رفتار، خوش گفتار، ہنستا کھیلتا مگر لوگ نہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں نہ نفرت کرتے ہیں ...... وہ ہمیشہ بین بین رہے گا "بیچ کا آدمی"، "درمیان کا آدمی۔"

نہ پیچھے رہ جانے والا، نہ بہت آگے نکل جانے والا۔

وہ نہ آغاز ہے نہ انتہا، بس بیچ کی کڑی جو ضروری ہوتی ہے جو ہونی چاہیئے اور جیساکہ ہمارے معاشرے میں ہے۔

میں نے عرض کیا نا، ناصر زیدی اچھا آدمی ہے اس میں کئی چھوٹی موٹی خوبیاں ہیں۔

ناصر بہت باخبر آدمی ہے ..... برصغیر کے کسی گوشے میں کوئی حادثہ ہو، کوئی کتاب چھپے، کوئی رسالہ نکلے ناصر کو اس کا علم ہوگا۔

کسی ادیب کے بارے میں، کسی شاعر کے سلسلے میں کوئی خبر چھپے ناصر کو اطلاع ہوگی ..... دوستوں کے متعلق ٹی وی سے، ریڈیو سے کوئی کلمہ خیر نشر ہو ناصر کے پاس اس کا ریکارڈ ہوگا ......

اور پھر سادہ دل ایسا کہ جو کچھ ہوگا، جس کا ہوگا، جس کے نام ہوگا، اپنا ہو یا پرایا، دوست ہو کہ دشمن، ناصر زیدی اس کے کریڈٹ کا ذکر کرے گا ..... اس کا یہ رویہ ادیبوں کے عام ڈگر سے بالکل ہٹ کر ہے۔

تو پھر کیا حرج ہے میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں اگر اسے معصوم کہہ دیا جائے (چونکنے کی بات نہیں) وہ طویل مخاصمت کی فطرت نہیں رکھتا۔

وہ جب بھی ملے گا، جہاں بھی ملے گا اس کے ہاتھ ایک دو بڑے لفافے، ایک دو کتابیں، رسالے ضرور ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ دوچار

تازہ تازہ خبریں بھی نہ ہوں۔

اس بارے میں ایک اور شخص تاج سعید بھی اس کا مدمقابل ہے وہ بھی خبروں سے بھرپور آدمی ہے اور نیت میں ناصر زیدی جیسا ....،

کبھی میچ ہوا تو زبردست مقابلہ ہوگا اور اب تو ایک کے کندھے سے "قند" کا اور دوسرے کے کندھے سے "ادب لطیف" کا بارِ گراں بھی اتر گیا ہے۔ دونوں فارم میں ہیں مقابلہ دلچسپ ہوگا۔

"کسوٹی" کے ماہرین عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف کے لیے لمحۂ فکریہ ؟

ایک بات سب مانتے ہیں ... ناصر زیدی نے لاہور کیا چھوڑا، سارا شہر سائیں سائیں کرتا ہے ... اردو بازار کے ناشر، لوہاری اور انارکلی کے پبلشرز، رائٹرز گلڈ کے دفاتر، ریڈیو اسٹیشن جانے والی سڑکیں، اور ٹی وی ہاؤس کی بند گلیاں، سب اداس ہیں۔

گو اس کا گھر آباد ہو گیا ہے مگر شہروں کا شہر لاہور، ویراں ہو گیا ہے۔

خالد احمد جب شہر نگارا میں اس کی کمی محسوس کرتا ہے۔

تو جل کر کہتا ہے، "چھوڑو یار ... کوئی شاعر بھی کبھی گھر داماد بنتے سنا ہے .....!؟"

مگر مجھے خالد احمد سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ شاعر تو ہے اور صاحبِ دیوان شاعر ہے، یہ الگ بات ہے کہ بیچ کے آدمی کی طرح شاعر بھی وہ بیچ کا شاعر ہے .... نہ بالکل بے نام، اور نہ بے حد نامدار ....،

لاہور میں رہتا تھا گزارہ چلتا تھا کہ عامیوں کا شہر ہے۔ پنڈی اسلام آباد میں تو "بقول شخصے" ادب کے پیرانِ پیر رہتے تھے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ یہ جنڈی میں پھنس کر بے چارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ہ

کیا کہا تھا عطاء الحق قاسمی نے، کہ گیلری میں بیٹھ کر شیدا بے چارہ تالی بھی نہیں بجا سکتا......!

ایک بات اور.... ناصر زیدی کی ایک منفرد خوبی کا ذکر نہ کیا گیا تو بے انصافی ہوگی.....

ناصر پیشہ ور الیکشن لڑنے والوں میں سے ہے۔ اسے وہ سارے گُر آتے ہیں، ہر سطح کے وہ داؤ، جو الیکشن جیتنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، ورنہ محمد طفیل جیسا ادبی دیو اسے اپنے پینل میں نہ رکھتا۔

اگر ناصر واقعی کسی لینڈ لارڈ کا نورِ چشم ہوتا تو وہ بلا تامل اور تسلسل سے قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہوتا لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے اس کی سرشت، اس کی فطرت، بین بین رہنے والا آدمی،

اس کی صلاحیتیں الیکشن جیتنے تک محدود رہتیں، وہ نہ پارلیمانی سیکریٹری بنتا نہ وزارت اور سفارت کی نوبت آتی کیونکہ....

مزاج کج کلاہی ودیعت نہیں ہوا.....

تو پھر ناصر زیدی کے بارے میں اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ گھنیرے بالوں والا یہ آدمی بھلا مانس ہے۔

بس ذرا چکنا ہے ملائم سا،

لیکن اب تو دو بچوں کا باپ ہے۔

گویا یہ باب بھی ختم ہوا.....!

منشا یاد

کامیاب آدمی

چھوٹا قد، چوڑا چکلا سینہ، گول مٹول جسم، منشا بظاہر تو اچھا آدمی لگتا ہے، لیکن ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے۔ اس ڈیل ڈول کے لوگ مروّت سے خالی ہوتے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

منشا یاد سے میری دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں وہ بھی روائتی سی، دونوں گھٹے گھٹے سے رہے، نہ وہ کھلا نہ میں کھلا، مختصر ملاقاتیں۔ ایک دوسرے کا احترام کا پردہ حائل رہا، کتاب چھپی تو بھیج دی اس نے بھی، میں نے بھی، بہ روائتی سا تعلق تھا لیکن میں اس کے اندر نہ جھانک سکا۔

مختصر ملاقاتوں میں جو دیکھا اور سُنا اس طرح کہا جا سکتا ہے .... گفتگو نپی تلی، لیکن شکل وصورت سے مجھے نہ بھایا... وہ جو فطانت اور معصومیت کی لہر سی ہوتی ہے جیسے فیض کے چہرے پر، عارف عبد المتین کے چہرے پر، عنقا تھی منشا یاد کے چہرے پر.....!

اس کی آنکھوں کی اجنبیت نے میرے من کے دروازے پر دستک نہ دی۔ اس کے چہرے کے خدوخال نے اپنائیت کا سندیسہ نہ دیا اور شاید اس کے وجدان نے مجھے بھی قبول نہ کیا۔ حالانکہ میں محبتیں کرنے والا آدمی ہوں۔

پھر سوچا.... لوگوں کے اندر جھانکنے کا فائدہ، جو محبت آشنا نہیں اسے اپنی دنیا میں رہنے دو، جو اندر نہیں آتا اُسے گلی میں ملو جو ڈرائنگ روم

ہیں نہیں بیٹھتا اس سے دروازے پر ملو، یوں کسی حد تک مشکل آسان ہو گئی۔
لیکن منشا کے متعلق میں نے جو کچھ جانا، دوسروں کے حوالے سے جانا، تب حیرت بھی ہوئی کہ کسی سے سرگوشی کر دو تو لوگ کیسے کیسے راز اگل دیتے ہیں۔
ایک صاحب بولے ... چھوڑو یار، جیسا بے رس چہرہ، ویسا بے رس اندر سے، وہ اچھا آدمی نہیں ہے!
منشا کے ایک دوسرے کلیگ نے کہا ... ''وہ طرار آدمی ہے، باعمل آدمی ہے، کامیاب آدمی ہے، مگر روکھا آدمی ہے، اس میں محبت نہیں ہے''!
ایک اور جاننے والے نے کہا ... ''منشا بڑے مزے کا آدمی ہے اگر ''لو اور دو'' کا مسئلہ نہیں تو اسے دوست بنانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ لے لیتا ہے دیتا کچھ نہیں''!
ایک اور صاحب نے کہا ... ''میں تو اسے کامیاب آدمی سمجھتا ہوں، تیسرے درجے کا افسانہ نگار ہونے کے باوجود ادبی سیاست میں نمایاں نظر آتا ہے ..... !
میں نے اسے ٹوکا ... ''یہ زیادتی ہے اس نے اچھے افسانے لکھے ہیں، کم از کم دوسرے درجے کا افسانہ نگار تو وہ ہے''۔
جواب ملا ... ''اس کی ٹیم تو اسے صفِ اوّل کا افسانہ نگار کہتی ہے، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ انتظار حسین نہیں بن سکتا، پروپیگنڈا ادب میں کب چلا ہے کہ اب چلے گا!؟''
''مگر امرتا پریتم نے اس کے افسانوں کا ترجمہ کیا ہے''! میں نے دفاع کیا۔
''سیاست کی بات مت کرو، بھارت والے تو یہاں کے چوہوں کو بھی دوردرشن پر پیش کر کے اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں اور پھر امرتا پریتم کو ہم سند کیوں مانیں ....؟''

عطاء الحق قاسمی نے رائے دی ... "منشا یار باش آدمی ہے"۔
امجد اسلام امجد نے کہا ... اسلام آباد کا "سکے ٹو" سر کرنے کے لیے منشا یاد ہمارا بیس کیمپ ہے!"
گلزار وفا چودھری نے کہا ... رات گئی بات گئی، ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ٹھکانہ تو ہونا چاہیئے!!"
منشا یاد میں ایک کمال اور بھی ہے وہ کسی کے خط کا جواب نہیں دیتا، کم از میرے کسی خط کا جواب انہوں نے نہیں دیا ... پتہ نہیں، اس کی وجہ فنکارانہ لاابالی پن ہے یا جبلی پوستی پن، یا بے اعتنائی برتنے کی بے ساختہ ادا یا افسرانہ خُو بُو کی نخوت اور عادت کہ فائل پنڈنگ رکھو، رکھتے چلے جاؤ، فائل پہ فائل، کبھی تو آگے کا سالا، فائل کو پہیے لگوانے، ان کی یہ ادا بھی حسب معمول تھی کیونکہ یہی سرخ فیتے کی پہچان ہے!
بہرکیف میں اس کی بے نیازی سے محظوظ ہوتا رہا، ایک خط میں نے اسے لکھا۔ تم کنواری لڑکی تو ہو نہیں کہ بعد میں تمہارے لو لیٹر بلیک میلنگ کے طور پہ کام آئیں۔
مگر اسے شرم نہ آئی، بالکل چکنا گھڑا ...!
اور جب آمنا سامنا ہو تو خار پشت کی طرح سر پیٹ میں چھپا لیا، اب لاکھ ٹھوکریں مارو، فٹ بال کی طرح لڑھکتا جائے گا، مگر چوٹ نہیں کھائے گا!
ان کی یہ ادا بھی مجھے پسند آئی ...
منشا پیشے کے طور پہ انجینئر ہے اس لیے ناپ تول کا قائل ہے۔ جذبات کا حصہ بخرہ بھی انچوں اور فٹوں کے حساب سے کرتا ہے، محبت کرنے میں بھی شاید اس لیے بخیل ہے کہ اگر مصالحہ قدرے تیز ہو گیا تو بے چارے ٹھیکیدار کا نقصان ہو جائے گا ...!
تعمیر اور تخریب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

تخریب ایسی ہو کہ اس پر تعمیر کا شائبہ ہو اور تعمیر ایسی ہو کہ مزاج میں موجود ہو۔

زندگی میں بھی یہی رویہ رکھو، کہ جو نظر آتے ہو، باطن اس کے برعکس ہو اور باطن کا اصل، چہرے پر ظاہر نہ ہو!

اور اگر بات منشایاد کی ہے تو پھر جو مرضی یار کی، وہ ہم سب کی، کیونکہ ہم سب کے چہرے بہت ملتے جُلتے ہیں، ہم سب منشایاد ہیں، ہم سب رحیم گل ہیں اور ہم سب اقبال ساجد ہیں!

خدا بہتر جانتا ہے!!!

❀ ❀
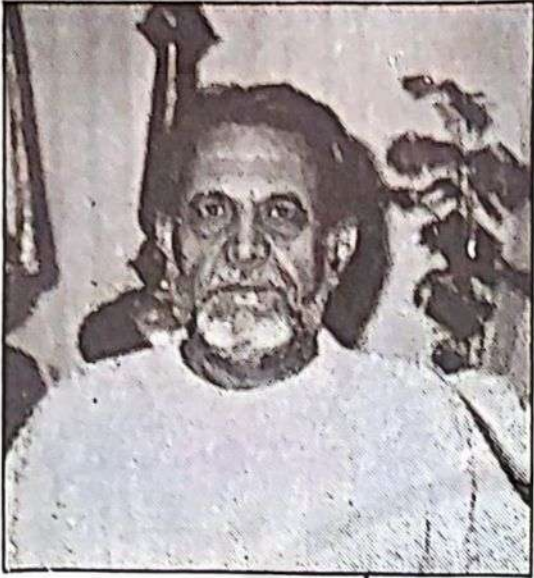
جالندھر کا پٹھان

اشفاق احمد خان

جالندھر کے پٹھانوں میں جہاں منیر نیازی کی آنکھیں، زندہ، زندہ روشن روشن، جگمگ جگمگ کرتی نظر آتی ہیں وہاں اشفاق احمد کی آنکھیں مری مری گدلی گدلی سی لگتی ہیں۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ایک اُجلے اُجلے شعر کہتا ہے اور دوسرا اجلی اجلی نثر لکھتا ہے۔

میں اس تضاد کا تجزیہ کر سکتا ہوں کہ جہاں منیر نیازی کا چہرہ معصوم اور سپاٹ ہے وہاں اشفاق احمد کا چہرہ تفکر کی جھرّیوں سے منور ہے۔

کبھی کبھی تو اس شخص کی جھریوں بھری تصویر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ زندہ اشفاق کی تصویر نہیں ہے بلکہ اس مجسمے کی تصویر ہے جو اشفاق احمد کی موت کے بعد کسی ماہر سنگ تراش نے تراشا ہے۔

عجیب بات ہے کہ آدمی وقت سے پہلے مجسمہ بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہے یہ محض رحیم گل کا تصور ہی ہو ۔۔۔!

لوگ اشفاق احمد کو تلقین شاہ کے ناتے سے جانتے ہیں لیکن ذاتی طور پر اسے "گڈریا" کے مصنف کے واسطے جانتا ہوں ۔۔۔

اگر میں نے اس کے دو چار افسانے پڑھے ہوتے تو ٹی وی ڈرامہ لسٹ یا تلقین شاہی خصوصیات کی بنیاد پر کبھی اس کا خاکہ نہ لکھتا۔

مانا کہ اس کا تلقین شاہی رویہ ملک کے لیے اور خود اس کے لیے

بے حد مفید ثابت ہوا لیکن حیف ... کہ دنیا ایک بے مثال تخلیق کار سے محروم ہوگئی، ایک بڑا ادیب ہاتھ سے جاتا رہا۔

وہ ریڈیو کے لیے لکھتا ہے کہ چولہے کی آگ سلگتی رہے وہ ٹی وی کے لیے لکھتا ہے کہ حلوا چلتا رہے .... وہ فنون کے لیے نہیں لکھتا، نقوش کے لیے نہیں لکھتا کہ "واہ واہ" سے کاروبارِ حیات نہیں چلتا۔

"داستان گو" والا اشفاق احمد دور .... کہیں بہت دور چلا گیا ہے!

ہمارے ایک دوست ہیں عطاء اللہ ہاشمی، یہ فلم ساز بھی ہیں بار سوخ اور دبنگ بھی، اگر آپ کی ان سے جان پہچان ہے اور آپ کے لڑکے نے محلے میں قتل کر دیا ہے تو فوراً ان سے ملیے، صورتِ حال سمجھایے، شاہ جی فوراً" کہیں گے۔

"تے فیر کی ہویا قتل ہی ہو یا نا، چلو تھانے دار نو ملیے!"

یہی حال اشفاق احمد کا ہے وہ اتنا ذہین آدمی ہے اگر ٹی وی والے اسے کہہ دیں .....

خان جی .... یہ سامنے لاش پڑی ہے اس پر ڈرامہ لکھ دیں"

تو وہ فوراً کہے گا ... تے فیر کی ہویا ہدایت اللہ، اے سئے ڈرامہ!"

اور تھوڑی دیر بعد لاش ایسے ایسے مکالمے بولے گی کہ سننے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں گے ....

"بلے .... نعش ہم زبان دارد !!"

میکرز دیک اشفاق احمد ڈرامے نہیں اداریے لکھتا، کبھی ٹول ٹیکس پر، کبھی محصول چنگی پر اور کبھی لاجواب پرواز پر۔

موضوع دینی ہو یا بے دینی، ایک ماہر مدیر کی طرح اسے بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے ... وہ غلط بات کو صحیح اور صحیح بات کو غلط ثابت کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے .... لیکن :

ایک بات طے ہے اشفاق احمد کے ڈرامے متحرک نہیں ہوتے وہ کھڑے رہتے ہیں بالکل ساکن، ایک جگہ پہ، وہ دریا کی طرح بہتے نہیں۔ کنوئیں کے پانی کی طرح کناروں سے دور رہتے ہیں، ان میں سچوایشن نہیں ہوتی، زور تکلم ہوتا ہے، وہ ہمیشہ رک جاتا ہے ایک گھر میں ایک کمرے میں، جغرافیے کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ تازہ ہوا میں نہیں نکلتا! میں اسی لیے کہتا ہوں وہ اداریے لکھتا ہے۔

لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ اچھا اداریہ نویس ہے!

اشفاق احمد صرف قلم کا ہی نہیں باتوں کا بھی دھنی ہے۔ میں جب ان کی کامرانیوں پر غور کرتا ہوں تو اپنی ناکامیوں کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

"لفظ کی ادائیگی اور "حرف" کا صحیح استعمال بازارِ زندگی کے گھپ اندھیروں میں جگنو بن کر راستہ بناتے ہیں۔۔۔۔ اشفاق احمد نے لاکھوں جگنوں پال رکھے ہیں۔

اشفاق احمد بذلہ سنج آدمی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔ مگر زیر لب کہا جاتا ہے کہ ان کے اندر ایک چھوٹا سا فرعون بھی بستا ہے۔

یہ فرعون کب وارد ہوتا ہے اور کن لوگوں نے دیکھا ہے یہ تو سرگوشیاں کرنے والے جانیں، ہمیں تو یہ شخص یوں لگتا ہے کہ باجی قدسیہ نے اسے پسند کیا ہے۔

اشفاق احمد پہ قلم اٹھانے سے پہلے ایک ادیب سے پوچھا۔

اشفاق احمد کیسا آدمی ہے۔۔۔۔؟

جواب ملا۔۔۔ "میں نے پٹھانوں میں اتنا خطرناک حد تک ذہین آدمی نہیں دیکھا۔۔۔!"

میں نے سوچا۔۔۔ یہ منافقانہ جواب ہے اور آگے بڑھ گیا۔

ایک اور صاحب سے پوچھا۔۔۔ اشفاق احمد ادیب کیسا ہے؟

جواب ملا...." ادیب کیا معنی....! اس نے لکھا ہی کیا ہے، آہنگ محض آہنگ، یا لواسطہ یا بلاواسطہ !!"

میں حیران رہ گیا اور آگے بڑھ گیا...

تیسرے نے جواب دیا...." لمحہ آسودگی اور لمحہ تخلیق کا کیا میل !"

پوچھا...." اس کا مطلب....؟

فرمایا...." عرفان شکم اور عرفان ذات کا مسئلہ ہے یہ !"

چوتھا بولا...." زیرک آدمی ہے. لیکن فن کارانہ لا ابالی پن سے عاری"۔

پانچواں بولا.... افسوس! وہ منیر نیازی کی طرح نہیں ہے"۔

میں نے پو...." اس سے مراد ....؟"

بولے...."منیر نیازی قلندر آدمی ہے لیکن آدمی ہے۔ لیکن لوگ اس سے ڈرتے ہیں اور اس سے محبت بھی کرتے ہیں. مگر اشفاق ایسا نہیں ہے۔

میں نے پوچھا...." یہ کیا گورکھ دھندا ہے کبھی دو آدمی بھی ایک مزاج کے ہوئے ہیں. ہاتھ کی لکیریں ایک جیسی نہیں ہوتیں دو بھائیوں کی سرشت الگ الگ ہوتی ہے. ضروری نہیں ہوتا کہ بیٹے کی خصلتیں ہو بہو باپ کی طرح ہوں.... پھر لوگ کیوں تقاضا کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کی طرح نہیں ہے....؟

میں سوال پر سوال کرتا رہا.... سوال تقریباً ایک تھا مگر جواب مختلف تھے. جب ننانوے پورے ہو گئے تو خیال آیا ایک باقی رہ گیا ہے، اس سے بھی پوچھ لوں.... تو جواب ملا.

"ٹھیک ٹھاک آدمی ہے اشفاق احمد، نہ منحرف، نہ منتقم، وقت ضائع نہیں کرتا، وقت کو روپے کی طرح خرچ کرتا ہے. خود کاشت کرتا ہے خود ہی کاٹتا ہے.... دوسرے کا پانی نہیں کاٹتا، اپنا پانی کاٹنے نہیں دیتا.... بے علموں سے رابطہ نہیں، بے عملوں سے دوستی نہیں، باخبر، باعمل،

مستعد...... جیسے بیسویں صدی کے آدمی کو ہونا چاہیئے!"

میں نے سوچا...... ٹھیک ہے. اس نفسی نفسی کے دور میں جہاں دستار ملامت دوسروں کے سر اور دستار فضیلت اپنے سر باندھنے کا رواج ہے وہاں سو، ہزار اور لاکھ میں سے ایک آدمی بھی اچھا کہتا ہے تو وہ یقیناً ٹھیک ٹھاک آدمی ہے. تب میں نے نتیجہ اخذ کیا......

جو لوگ اشفاق احمد کی مخالفت کرتے ہیں. میری طرح مقدر کے مارے ہوئے لوگ ہیں...... وہ اشفاق احمد ہی کی نہیں ... محمد طفیل کی مخالفت بھی کرتے ہیں. احمد ندیم قاسمی کی مخالفت بھی کرتے ہیں بے چارے محروم لوگوں کے پاس ندمت کے سوا ہوتا ہی کیا ہے؟

لاہور میں چھبیس ستائیس سال سے رہ رہا ہے، اشفاق احمد سے میرا زیادہ قرب نہیں رہا. کبھی ان کے دولت خانے پر جانے کا شرف حاصل نہیں ہوا نہ کبھی میرے غریب خانے پہ ان کی تشریف آوری ہوئی ہے، نہ انہوں نے کبھی پیار سے پچکارا، نہ مجھے پیار کے اظہار کی ہمت ہوئی.

کسی تقریب میں آمنا سامنا ہوا تو سلام میں پہل ہمیشہ میں نے کی، وہ ہلکے سے سرپرستانہ انداز میں متبسم ہوئے، ہم وارے وارے گئے کہ صوفیوں کے ٹولے کا آدمی ہے، خدا جانے یہی لمحہ التفات کا ہو اور ہماری بگڑی سنور جائے.

ویسے ایک بات کہتا چلوں کہ اشفاق احمد میں غرور اور تکبر نہیں ہے وہ ریشم پہن کر متاثر نہیں کرتے اور نہ ٹائی سوٹ کا رعب ڈالتے ہیں. سیدھے سادے کپڑے پہنتے ہیں...... البتہ کھدر کے کرتے میں ریشمی باتیں ضرور کرتے ہیں. بہت عیاشی کا موڈ ہوا تو ٹاٹ سے کا کرتہ پہن کر سٹیج پہ اتراتے ہیں.

ویسے سنا ہے زبان کے چسکوں میں ان کا جواب نہیں. جتنی دیر گھر میں رہتے ہیں باجی قدسیہ کچن سے باہر نہیں آتیں.

آخر میں ایک بات اور .... ان کی ممتاز مفتی سے خلقی قربت ہے اس کا بیسواں حصہ بھی ہمارے حصے میں آتا تو آج کم از کم بیس صفحے کا خاکہ لکھتا ۔ ۔ ۔ !
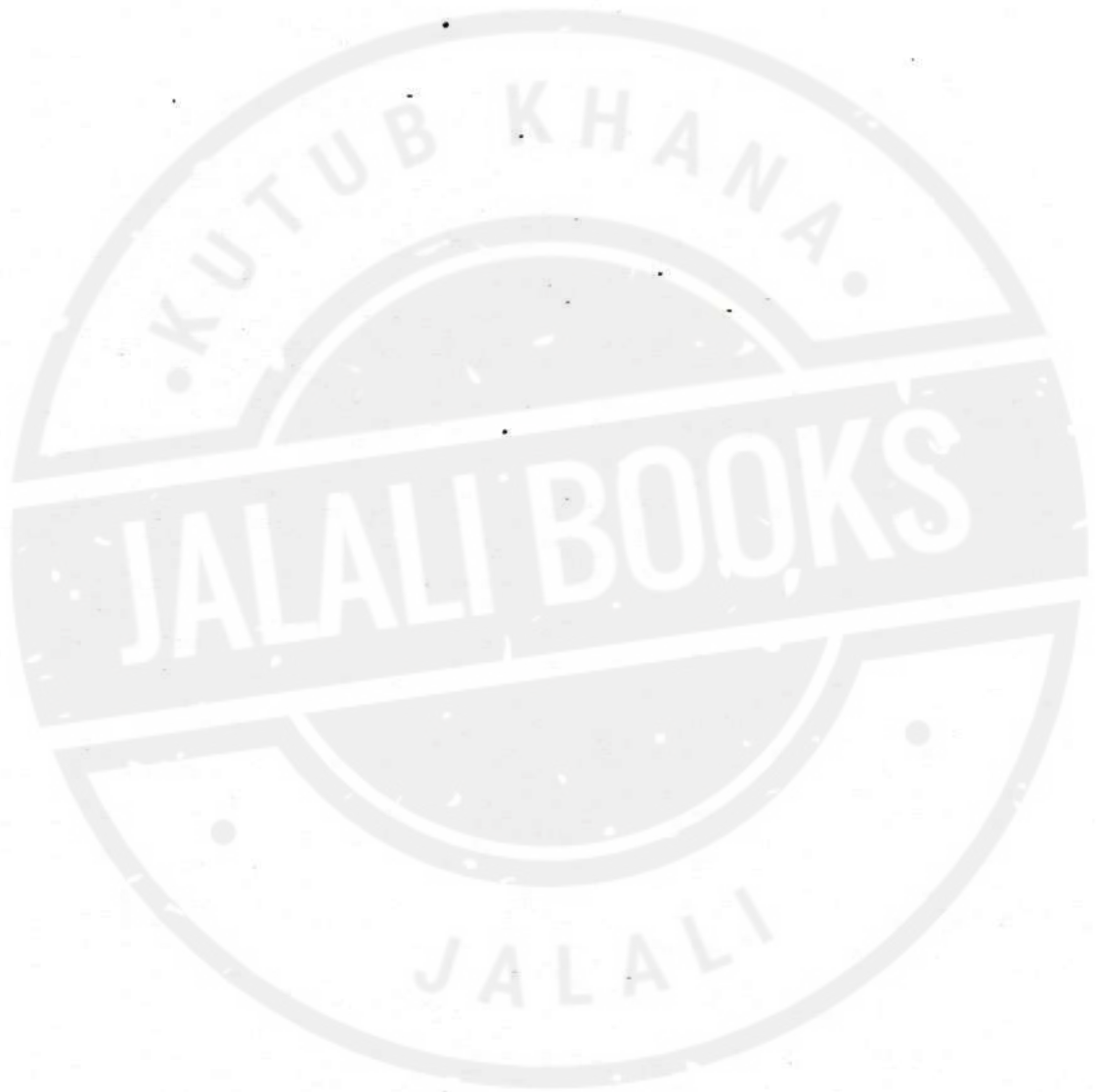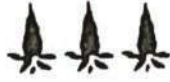
ممتاز ادیب رحیم گل مرحوم کی آخری تحریر

سوہنا کرنل

کرنل دلنواز دل

خوبصورت شاعر، خوبصورت آدمی!
وردی میں سچ مچ کا کرنل، اور قومی لباس میں ایک خوبصورت شہری۔
نام دلنواز، کام دلنوازی!
لمبا وجیہہ اور شکیل دلنواز۔ شاید اپنی فوجی یونٹ میں کمانڈنگ آفیسر لگے تو لگے، ورنہ نجی زندگی میں سراپا شاعر۔
فوجی افسروں کے متعلق جو ایک عام تاثر ہے، خشک، بے لچک، ٹھوس اور اٹل۔
ایک لحاظ سے ہم بالکل یکطرفہ فیصلہ کرتے ہیں۔ بظاہر یہ ساری خامیاں یا خوبیاں ایک اچھے فوجی کی شناخت کے لیے بھی ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن جب فوجی شاعر بھی ہو تو اس کے کردار میں ان باتوں کے ساتھ شاعرانہ گداز بھی آجاتا ہے اور اس کی شناخت بھی بدل جاتی ہے۔
جیسے میجر جنرل شفیق الرحمٰن، جنرل خالد محمود عارف، کرنل محمد خان،

بریگیڈیر صدیق سالک، میجر ضمیر جعفری اور کرنل غلام سرور۔
کرنل دلنواز کا شمار بھی اسی فوجی ٹولے میں آتا ہے۔ جسے عام فوجیوں میں امتیاز اور عام شہریوں میں منفرد حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور جس نے اپنی پہچان شعر سے کرائی ہے۔
کرنل دلنواز عام ادبی محفلوں میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ کوئی خاص محفل ہو تو آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ مگر ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے ایک اچھے آدمی سے ملاقات کا تاثر دیر تک قائم رہتا ہے اور پھر ہمیشہ خواہش رہتی ہے کہ ان سے ملاقات ہوتی رہے اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔
کرنل شکل وصورت کے لحاظ سے ہی نہیں کردار کے لحاظ سے بھی خوبصورت ہیں ان کے اجتماعی برتاؤ میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور حسن ہے اور انتہا کے وضع دار آدمی ہیں۔
وہ جتنے کھرے آدمی ہیں اتنے ہی دھیمے، ستھرے اور پیار کرنے والے بھی۔
وہ اگر فرض منصبی سے آگاہ فوجی ہیں تو اس ملک کے ایک ذمہ دار شہری بھی۔
ان کا تخلص دل ہے اور وہ سراپا "دل" ہیں۔
بعض اوقات شعوری یا غیر شعوری طور پر نام اور تخلص کا ایسا میل ہو جاتا ہے کہ آدمی اسم بامسمّٰی بن جاتا ہے۔
کرنل دلنواز دل کے ساتھ بھی قدرت نے یہی فیاضی برتی ہے۔
ایک زمانہ تھا جب فوجیوں کے لیے لفٹ رائٹ کے سوا کوئی بات جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اخبار بھی نہیں پڑھتے تھے کہ سیاست کی شدھ بدھ سے بچے رہیں۔
فلموں میں بھی فوجی افسروں کا جو کردار پیش کیا جاتا تھا وہ احمقانہ

حد تک مضحکہ خیز ہوتا تھا۔ لیکن وہ زمانے تو گئے، اور سچ تو یہ ہے کہ انگریز قوم کو ایسے ہی فوجی کی ضرورت ہوتی تھی جو زبان سے کچھ نہ کہہ سکیں البتہ سینے پر گولی کھا سکیں۔

مگر آج ایسا نہیں ہے۔ آج ہماری قوم کا اعلیٰ ترین طبقہ فوج میں جاتا ہے بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ہمارا ذہین ترین طالب علم دوسری ملازمتوں کے مقابلے میں فوجی وردی پہننے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فوج میں کرنل دلنواز دل جیسے لوگ آگئے ہیں جو صرف جسمانی طور پر فٹ نہیں ہیں ذہنی طور پر بھی مکمل فٹ ہیں۔

ان کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے ہاتھ میں قلم ہے جہاں تلوار چلانے کی ضرورت ہو۔ تلوار چلاتے ہیں، جہاں تلوار سے کام نہیں چلتا قلم اٹھا لیتے ہیں اور جب قلم نغمہ ریز ہوتا ہے۔

میرے نغمے تمہارے لیے ہیں!

تو کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں اور دشمن کو راہ فرار نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری فوج نہ صرف مادی طور پہ مسلح ہے بلکہ علم اور قلم نے اسے دودھاری تلوار بنا دیا ہے۔

کرنل دلنواز بھی ایک ایسی ہی تلوار ہے جسے پنجاب کی مٹی نے جنم دیا فوج کی بھٹی نے کندن بنا دیا اور شعر نے اس کے کردار کو آب دیا۔

اور نتیجہ اس تصادم کا یہ نکلا۔

کہ ہمیں ایک خوبصورت شاعر ملا،

ایک ٹھوس فوجی،

اور ایک گداز دل،

اور نام پڑا اس کا دلنواز!

شمس العاشقین حضرت خواجہ
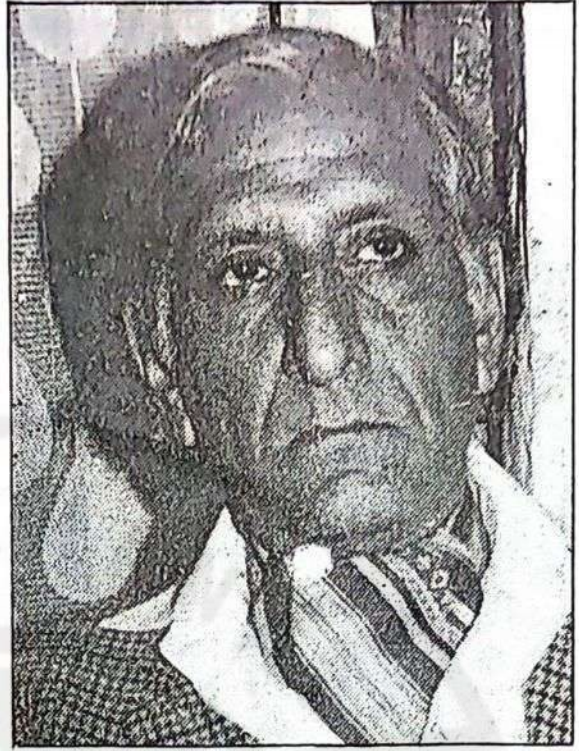
اظہر جاوید

گیسو دراز

شرط حرام سہی، لیکن لگائی جاسکتی ہے۔ لاہور کی تیس لاکھ آبادی کے شہر میں اگر کوئی اظہر جاوید کے چہرے پر سجی ہوئی ناک سے اونچی ناک لائے..!! بلا خوف وخطر شرط بدی جاسکتی ہے..... ادھر کسی عزیز کا جنازہ اُٹھنے والا ہو، ادھر لڑکی سے اپوائنٹمنٹ ہو تو اظہر گورستان میانی صاحب کا رخ نہیں کریگا، جناح گارڈن میں پایا جائے گا!

جس طرح عدم فطری شاعر ہے اور جالب پیدائشی طور پر حزب اختلاف کا آدمی ہے اسی طرح اظہر پیدائشی عاشق ہے..... جس دن اظہر کا جنم ہوا تھا، میاں رلبجے کی "ونجلی" نے "جی آیاں نوں" کا سُر چھیڑا تھا۔ حضرت بلقیس نے گھٹی کا اہتمام کیا تھا۔ مائی ہیر نے پوتڑے دھونے کا اور مس لیلیٰ نے لوری سنانے کا۔

نومولود اظہر کے چاروں طرف ہجوم عاشقاں تھا۔۔۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا، پھر اس کی نظریں زچہ پر جم گئیں۔ وہ چند لمحے زچہ کو کچی کچی نظروں سے دیکھتا رہا پھر توتلی زبان میں بولا۔۔۔
سلمیٰ کہاں ہے، عذرا کہاں ہے۔ یہ گھر وہ تو نہیں جہاں دیحانہ رہتی تھی "!!"

شریف باپ، جو نومولود کے کان میں اذان دینے کی تیاری کر رہا تھا، آنکھیں جھکا کر باہر نکل گیا۔ ممتا کی ماری ماں انگشت بدنداں، کہ پہلونٹی کی "تخلیق کا کیا بنے گا؟
یوں یہ بچہ ماں کے لیے آزمائش اور باپ کے لیے امتحان بن کر دنیا میں آیا۔۔۔۔۔

اظہر کا رنگ اب کچھ پک گیا ہے۔ سنولا گیا ہے۔ آج سے بیس بائیس سال پہلے دبلا سا، کچا سا، گورا گورا سا ہوا کرتا تھا۔ بے حد خلوص سے ہنستا تھا۔ بہت پیار سے ملتا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ جیسی ناک اور لمبے لمبے جبڑوں کے باوجود اس شخص میں دلکشی تھی۔ میرا خیال ہے۔ اس کی پرخلوص، بے ساختہ ہنسی اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔
آدمی وضع دار ہے۔ بیس بائیس سال بعد بھی ملنے کا وہی انداز ہنسی میں وہی طرح داری اور دوستی میں وہی گرم جوشی۔۔۔! مجھے یہ آج اچھا لگتا ہے۔

بہت سے دوست شاید نہ جانتے ہوں کہ اظہر انتہائی پہلودار آدمی ہے۔ وہ مبارک احمد سے اس کی سطح پر ملتا ہے۔ خالد احمد سے اس کی سطح پر اور ڈاکٹر وزیر آغا سے اس کی سطح پر، حتیٰ کہ وہ احمد شریف کے گیت بھی چھاپ دیتا ہے۔
اظہر نے رزق حلال کے لیے بہت پاپڑ بیلے۔۔۔۔ سرگودھا سے کسب

معاش کا آغاز کیا۔ میدان تنگ پایا تو لاہور آ گیا۔ یہاں بھی اخبارات اور چھوٹے موٹے رسائل کے لیے کام کیا۔ ڈائجسٹوں کی سیڑھیاں بھی چڑھتا رہا اور جب کچھ نہ بن پایا تو اپنا دفتر بنا ڈالا اور ایک ادبی رسالہ "تخلیق" نکال دیا۔

یوں اس کی بکھری بکھری زندگی میں مرکزیت کی بنیاد پڑی اور یہ برگ آوارہ ایک چھوٹے گملے میں سج سجا کر پودا بن گیا.... بیج تو بیج ہی ہوتا ہے۔ موقع و محل موزوں پاتا ہے تو زمین کا سینہ پھاڑ کر ایک دن تناور درخت بن جاتا ہے۔

عالم آوارگی میں بھی دوستوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن دفتر بنا، ادبی پرچہ نکلا تو یاروں نے چاروں طرف گھیر لیا۔ اظہر جاوید نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایک ہزار ایک خواتین کو متعارف کرایا۔ پرچہ جب بھی مارکیٹ میں آیا، ایک سے ایک نئی شاعرہ کی تصویر چھپی دیکھی، دفتر جب بھی جانا ہوا، نئی ادیبہ کی زیارت نصیب ہوئی..... پتہ نہیں یہ شخص کہاں کہاں پہنچتا ہے۔ شاید اس کی قوت شامہ بہت تیز ہے۔ سونگھ سونگھ کر سراغ لگاتا ہے کہ کس گلی میں کون خاتون چھپنے کے لیے بے قرار ہے۔ پھر خود ہی غزل لکھتا ہے اور خود ہی اس کے نام سند جاری کر دیتا ہے۔ اس معاملے میں بے حد عالی ظرف آدمی ہے۔ بلکہ خدائی خدمت گار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

میری ایک کتاب چھپی۔ حسبِ معمول اظہر کو بھی ایک جلد پیش کی ہفتے کے بعد ملا، کہنے لگا۔

"انتہائی خوبصورت، اس سال کی بہترین کتاب !"

میں نے کہا.... "تبصرے میں یہ بات لکھ دینا۔"

لیکن جب "تخلیق" میں تبصرہ چھپا تو ایک غیر معروف سی ادیبہ نے تبصرہ لکھتے ہوئے کتاب کو مکمل طور پر رد کر دیا۔

میں نے اظہر جاوید سے گلہ کیا تو کہنے لگا.... "چھوڑو یار، بے چاری

خوش ہو گئی، تمہارا کیا بگڑے گا تبصرے سے۔

تو ایسے ہوتے ہیں ہمارے یار اظہر جاوید.....!

ایک بار ٹی ہاؤس کے کسی گوشے میں اظہر کسی خاتون نما نوجوان سے محو گفتگو تھے۔ جب مکالمے کا سلسلہ طول پکڑ گیا تو میں نے پاس بیٹھے ہوئے ذوالفقار احمد تابش سے پوچھا..... یہ اظہر کے ساتھ کون کھڑا ہے" لڑکا یا لڑکی.....؟

تابش نے جواب دیا... "لگتا تو لڑکا ہے، لیکن اگر واقعی لڑکا ہے۔ تو پھر دوسرا آدمی اظہر جاوید نہیں ہو سکتا، کیونکہ گوشہ خلوت میں اظہر جاوید کسی مرد کے ساتھ اتنا طویل مکالمہ نہیں کر سکتا...!

اور جب ٹٹولا گیا تو وہ سچ مچ اظہر جاوید تھا اور مخاطب لڑکی تھی!

لیکن عورت کے بار بار ذکر اور شیفتگی سے اظہر کی نفی نہیں ہوتی۔ وہ اس کے علاوہ بھی متنوع شخصیت ہے۔ اور اس کے پاس بیٹھنے کو جی کرتا ہے۔

کچھ دکھ بھی ہیں اس کی زندگی میں۔ لیکن یہ دکھ اس نے اپنی ذات تک محدود کر رکھے ہیں۔ دوستوں کو وہ صرف قہقہوں میں شریک کرتا ہے۔

کبھی بھی اور کسی نے بھی اظہر کے ماتھے پر شکن نہ دیکھی ہو گی۔ اچھے دن ہوں یا برے، اظہر نے دوستوں کو چائے ضرور پلائی ہے۔ قرض لیا یا ڈاکہ ڈالا، مگر روایت قائم رکھی، پیٹ خالی ہو مگر دل خالی نہ ہو تو آدمی کی پہچان میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے۔ اظہر دوستوں سے کشادہ ذہن اور کشادہ باہوں سے ملتا ہے۔ بعض لوگ تو ہاتھ ملانے میں بھی بخل سے کام لیتے ہیں، آنکھ سے آنکھ ملا کر وہی آدمی بات کر سکتا ہے جس کی نیت میں فتور نہیں ہوتا۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اظہر محض اللہ میاں کی گائے ہے۔ وہ دوستیاں کرتا ہے تو دشمنیاں بھی پالتا ہے.... وہ کس حد تک انتقام پسند ہے، میں نے اس کا یہ پہلو نہیں دیکھا، لیکن وہ اچھا دشمن ہے۔ ٹکے ٹکا کے دشمنی کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے۔ ہاتھ ملانے والا سیلوا جی ہے یا افضل خان؟

زیرِ آستین خنجر رکھنے والوں کی اسے پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے، ٹھوکریں کھاتا، گرتا اٹھتا، آج وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور "تخلیق" کی راہ سے سنجیدہ اخباروں کے کالموں تک پہنچ گیا ہے۔

یہ تو خیر سب مادی کامیابیاں ہیں۔ اظہر کوشش کرے گا، محنت کرے گا تو اور زیادہ ترقی کرے گا۔ لیکن وہ فطرتاً رومان پسند ہے۔ اس کا خمیر عشق و محبت کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے.... جہاں گجرات ہوگا، وہاں سوہنی ہوگی، جہاں سوہنی ہوگی وہاں مہینوال ہوگا اور جہاں لڑکی ہوگی وہاں اظہر جاوید ضرور ہوگا۔ صنفِ نازک کے سلسلے میں اس کی دیوانگی اور جنون کا یہ عالم ہے کہ کسی دن دفتر جائے گا اور "تخلیق" کی کرسی ادارت پر بیٹھی عذرا اصغر سے پوچھے گا،

"عذرا کہاں ہے، سلمٰی کہاں ہے۔ یہ گھر وہ تو نہیں جہاں ریحانہ رہتی تھی....؟

اقبال ساجد

اقبال ساجد ناکام آدمی ہے۔ اس سے اچھا شاعر ہے۔ بہت ہی اچھا شاعر، پیشہ ور چسکی نوش۔ ؟؟

اگر دس دس منٹ کے وقفے سے بلیں جگہوں پر جائے تو چائے سے انکار کو کفرانِ نعمت سمجھتا ہے۔

رنگ کالا، بال کالے، مگر شعر اُجلے اُجلے، سیاہ رو بھی کہوں تو کوئی حرج نہیں، مگر سیاہ دل نہیں کہوں گا کیونکہ خود میں اور آپ بھی دلِ نورانی کا دعویٰ کب کرتے ہیں۔

اقبال ساجد سراپا نفی ہے، رد کرنا اس کی سرشت ہے۔ کلمۂ خیر سے خدا واسطے کا بیر، وہ بیوی کو بھی ٹوکتا ہوگا کہ زیادہ پانی کیوں پیتی ہے۔ اور ہوا پر گزارہ کیوں نہیں کرتی۔ اس عورت کو تمغۂ امتیاز ملنا چاہیے جو ساجد کے بچوں کی ماں ہونے کا دم بھرتی ہے اور اس کے بچے، وہ بچوں کو بھی ڈانٹتا ہوگا کہ ان کی ناکیں اور آنکھیں ہو بہو باپ کی طرح کیوں نہیں؟ وہ غلے والوں سے بھی ناراض ہوگا کہ شاعر کے مقامِ اعلیٰ کا شعور نہیں رکھتے اور یہ سماج ویسا کیوں نہیں جیسے اقبال ساجد نے سوچا تھا؟ زندگی اس کے نزدیک ذمہ داری نہیں محض ایک شعر ہے۔ اس لیے وہ کام نہیں کرتا، البتہ بچے پیدا کرتا ہے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ دودھ کا انتظام بھی کرے۔ بچے پیدا کرنا اور شعر اُگلنا فطری عمل ہے مگر کام، وہ کام نہیں کرتا کہ شاعر ہے۔ بڑے شاعر کام نہیں کرتے۔ پچھلی صدی میں غالب کی مثال

سامنے ہے۔ اس صدی میں منیر نیازی موجود ہے۔ اقبال ساجد ان دونوں سے کم شاعر کہلوانے پر راضی نہیں ہوتا۔

اور یہ کیسے ممکن ہے، ندیم، فیض اور فراز کو خاطر میں نہ لانے والے شاعر کو کام پر مجبور کیا جائے!

دنیا کو چاہیئے اس کے شعروں کو سلام کریں، لوگوں کا فرض ہے کہ خوانِ نعمت کا انتظام کریں۔

اقبال ساجد بے حد مستقل مزاج آدمی ہے وہ اس ناقدری کے خلاف مسلسل چیلنج ہے۔ لوگ مانیں نہ مانیں وہ خود اپنے آپ کو مانتا ہے اور یہیں سے اقبال ساجد کے المیے کا آغاز ہوتا ہے۔ میری آرزو تھی کوئی ایسا شخص ملے جو اقبال ساجد کا شیدائی ہو اور دل کی گہرائیوں سے اس کی تعریف کرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہر کا شہر ہی شاعر سے برگشتہ ہے، کوئی شخص راضی نہیں، کوئی آدمی خوش نہیں، آدم بو آدم بو کی آوازیں اٹھ رہی ہیں احتجاج کا اجتماع ہی کبیدہ خاطر ہے!

میں نے سوچا، یہ سچا شاعر ہے کہیں فٹ نہیں بیٹھتا۔!!

مگر حیف! قدرت نے اسے تخلیقی قوتوں سے نوازا۔ مگر شخصیت بنانے میں ڈنڈی مار گئی۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے شخصیت کی طرح اس کی گفتگو بھی تار تار، وہ باتوں سے بالکل متاثر نہیں کرتا، وہ ادب کی نچلی سیاست میں الجھا رہتا ہے اور کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ ہم خیال بنانے کے ڈھنگ سے آشنا، وہ دل جیتنے کا گر بالکل نہیں جانتا، البتہ دل دکھانے میں قافلہ سالار ہے، مگر اس کی نیت بری نہیں ہوتی وہ بے حد معصومیت سے دل زخمی کرتا ہے!

اقبال ساجد سے مل کر خوشی ہوتی ہے، نہ شرمندگی، دوست اسے بالکل اچھا شاعر مانتے ہیں مگر تعظیم نہیں کرتے۔

بہت سے لوگ جو آسمان شہرت پر جگمگا رہے ہیں. اقبال ساجد سے
اچھے شاعر نہیں ہیں لیکن اپنی سبکسار شخصیتوں کی وجہ سے اقبال ساجد کو
بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بات اقبال ساجد کے سوچنے کی ہے کہ خوبصورت
شاعری کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی ہوتی ہیں جو آدمی کو ممتاز بناتی ہیں۔
شاید اگلی صدی، جب اقبال کی شخصیت سے لوگ کم کم واقف ہونگے
اس کی شاعری کو مزید عزت ملے؟
لیکن زندگی، ایک شیریں اور تلخ حقیقت، جیب میں اٹھنی نہ ہو
تو شاعر کے دیوان کا خوبصورت ترین شعر بھی اسے بھاٹی گیٹ سے اسٹیشن
تک نہیں پہنچا سکتا، چونکہ اٹھنی والے آگے نکل گئے ہیں اور وہ پیچھے رہ گیا ہے
اب اس کے سوا چارہ ہی کیا کہ آگے نکلنے والوں پر سنگ باری کرتا رہے۔
چنانچہ اس پس منظر میں اس کے عالی ظرف دوست اسے کم ظرف کہتے ہوئے
کچھ اچھے نہیں لگتے اور اس کی شاعرانہ تعلی کو ناگفتنی کہنا بھی زیب نہیں دیتا۔
ایک بات اور۔ وہ کسی گروہ کا آدمی نہیں ہے۔ بایاں بازو ہو یا دایاں
بازو، گروپ بندی، اس کے ضمیر میں نہیں ہے۔ وہ خود ہی گرو خود ہی چیلا ہے۔
اقبال ساجد کو وہ سب کچھ پسند نہیں جو رسم و رواج کے مطابق ہو۔
منصوبہ بندی سے عاری، نظم ضبط سے نابلد، سازش کا خانہ خالی، حیلے بنانے
اور مکر سے بے نیاز، اور نہ اس کی ضرورت کہ شاعر ہے تک بند نہیں، یہی
وجہ ہے کہ اپنے منفرد شعر کی طرح تنہا بھی ہے۔
قدرت نے اسے کچھ فطری ودیعت کی ہے تو اس میں اقبال ساجد کا کیا
قصور، جب جذباتی وحشت اپنا رنگ لاتی ہے، کوئی میرا جی بن کر زندگی سے
الگ تھلگ ہو جاتا ہے تو کوئی اقبال ساجد بن کر دنیا کا نشانہ بن جاتا ہے۔
ایک دفعہ اندھیرے میں چھلانگ لگانے کے بعد سب کچھ کتنا آسان
لگنے لگتا ہے۔
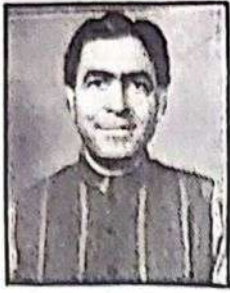
رحیم گل

اپنے بچپن کے واقعات سناتے ہیں

نام ... رحیم گل ... پیدائش ... جولائی ۱۹۲۴ء شکر درہ ضلع کوہاٹ ... تعلیم ... میٹرک ... مصروفیات ... ناول اور خاکہ نگاری ... قیام پاکستان سے قبل فوج میں بھی ملازمت کرتے رہے۔ تاریخ وفات : ۲۸، اپریل ۱۹۸۵ء

اپنے گاؤں سے دور باجرے کے کھیت میں دن گذارنا، چڑیوں کو پٹاخوں کے ذریعے اڑانا، کھیت کی منڈیر پر چڑھ کر گیت گانا اور افسانوں کی کتابیں پڑھنا میرے بچپن کے چند محبوب مشغلے تھے۔ ایک روز میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی کتاب پڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی تھوڑی تھوڑی دیر بعد چڑیاں اڑا رہا تھا کہ اچانک میری نظر کالے ناگ پر جا پڑی جو منڈیر کے قریب کھیت کی نالی میں سستا رہا تھا۔ میں نے منڈیر پر سے چھلانگ لگائی اور کوئی اینٹ یا پتھر تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں ناگ پھن کھولتا ہوا میری جانب لپکا اور اس نے مجھے ڈس لیا۔ کھیت سے گھر کوئی تین چار فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ چنانچہ میں ہمت کر کے گھر کی طرف دوڑا۔ گھر پہنچا اور اتنا بھی نہ بتا پایا کہ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں بے ہوش ہوگیا اور زمین پر گر پڑا۔ گھر والوں نے فوراً گاؤں کے معروف "مانندری" کو بلا بھیجا۔ اس نے زہر نکالنے کے لیے مجھے سینگ لگایا اور دم

بھی کیا۔ چونکہ میں مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس لیے مجھے جگائے رکھنے کے لیے میری آنکھوں میں مرچ بھی ڈالتے رہے اور زہر بھی زخم سے نکالتے رہے۔ المختصر میں کوئی بیس روز بعد چلنے کے قابل ہوا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس سے مجھ میں ہمت اور جواں مردی کے جذبات پیدا ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں آج بھی بڑی بڑی تکالیف برداشت کر جاتا ہوں۔

میرا لکھنے لکھانے کا آغاز بھی خاصا دلچسپ ہے۔ میرا ایک دوست کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اس کے خطوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا اس لیے وہ مجھے خط لکھ کر دینے کو کہتا اور میں اسے پندرہ پندرہ بیس بیس صفحات پر مشتمل خط لکھ کر دیا کرتا ایک روز اچانک اس لڑکی کی میرے دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے خطوں کی تعریف کی اور کہا کہ اگر میرا دوست کوشش کرے تو وہ ایک بہت اچھا ناول نگار بن سکتا ہے۔ یہ میرے لیے ایک اشارہ تھا جس نے مجھے بعد میں ادیب بنایا، ایک روز ابا نے مجھے ایک روپیہ دیا اور گاؤں کے ہندو کی دکان سے مٹھائی لانے کو کہا۔ میں نے ہندو کو روپیہ دیا، اُس نے مجھے مٹھائی دی اور ساتھ ہی نو روپے واپس دے دیے۔ اس نے یہ سمجھا کہ شاید میں نے اسے دس روپے دیئے ہیں۔ میں مٹھائی اور نو روپے لے کر گھر پہنچا اور ابا کو بتایا کہ ہندو بھول گیا ہے اور اس نے مجھے مٹھائی کے ساتھ نو روپے بھی دیے ہیں۔ ابا نے مجھے سمجھایا کہ ہندو نے غلطی سے تمہیں نو روپے دیئے ہیں۔ اگر تم نے اسے یہ روپے واپس کر دیئے تو وہ بہت خوش ہوگا اور تمہاری عزت اس کی نگاہوں میں اور بڑھے گی، یہ بات میرے پلے پڑی چنانچہ میں اس کی دکان پر گیا اور اس کے نو روپے لوٹا دیئے۔ ہندو میری اس دیانت داری پر حیران رہ گیا اور اس نے مجھے گلے لگا لیا اور میری اس ایمانداری سے بازار کے تمام دکانداروں

کو بھی آگاہ کیا۔ میں روزانہ جب سکول سے واپس گھر آتا تو وہ مجھے بلا کر تھوڑی بہت مٹھائی اور شاباش دے کر رخصت کرتا اس طرح مجھے بہت خوشی ہوتی۔

پرائمری کے ایک استاد پنڈت بودا رام ہمیں کھیتوں میں بیر بہوٹیاں پکڑنے کے لیے لے جاتے۔ ہم خوشی خوشی بیر بہوٹیاں پکڑ کر استاد کو دیتے وہ انہیں بوتل میں بند کرتے اور بعد میں ان سے دوائی تیار کیا کرتے تھے۔ ہم ان کے لیے "کھمبیاں" بھی توڑا کرتے تھے وہ ہمیں بھی کھمبیاں پکا کر کھلاتے تھے۔ کلاس روم میں پہلے وہ ہر بچے کا حال دریافت کرتے۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو اسے اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتے اور بچوں کو اس کے ساتھ بھیجتے کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئیں۔

چونکہ بچپن گاؤں میں گذارا تھا۔ اس لیے میں سمجھتا تھا کہ میری کل کائنات یہی "تل شکری" کی دکانیں اور "گنے" کے کھیت ہیں۔ اس مختصر سی کائنات میں میں نے پرائمری جماعت پاس کی اور یہیں سے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں مڈل کا امتحان کوہاٹ جا کر دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ امتحانات کے دنوں میں جب میں کوہاٹ پہنچا تو وہاں کے بازار پُر رونق، سڑکیں اور خوبصورت دکانوں پر خوبصورت لوگوں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہ گیا یہاں تک کہ میں امتحانات کے دنوں میں پڑھنے سے زیادہ شہر میں گھوما پھرا کرتا تھا۔ اسی دوران ایک روز فلم دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ فلم زیادہ تر لڑائی مار کٹائی پر مبنی تھی۔ میں فلم بھی دیکھ رہا اور دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا۔ ایک سین میں قاتلوں کی کار سامنے آتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ دیکھتے ہی میری چیخیں نکل گئیں اور میں روتا ہوا سینما ہال سے باہر نکل آیا۔ مجھے اُس وقت یہ علم نہیں تھا کہ میں بھی ایک روز فلم کا پروڈیوسر بنوں گا۔

سات خامیوں والا

احمد سعید

احمد سعید کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب میں لاہور میں آیا تھا۔ مگر گاہے بگاہے ان کو پڑھتا رہتا تھا۔ پہلی بار ان کو حلقہ ارباب ذوق میں افسانہ پڑھتے ہوئے سنا۔ جب حلقے میں بڑے بڑے جغادری ادیب بیٹھا کرتے تھے۔ جو معمولی سی زبان کی غلطی پر بھی آسمان سر پہ اٹھا لیتے تھے۔ احمد سعید اس زمانے میں جوان تھے اور ان کا بیٹا سلمان سعید غالباً انگوٹھا چوستا ہوگا۔

احمد سعید مسلسل لکھنے والا ادیب ہے۔ وہ کبھی نہیں رکا اور تسلسل سے لکھ رہا ہے۔ اس نے بے شمار افسانے لکھے بہت سے ناول، اس نے کچھ فلمیں بھی لکھیں، وہ آج بھی لکھ رہا ہے۔ اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں لکھ رہا ہے۔ لیکن احمد سعید میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ جس کی وجہ سے اُسے وہ تکریم نہ ملی جس کا وہ مستحق تھا۔

احمد سعید کی پہلی خامی یہ ہے کہ وہ شریف آدمی ہے اور شریف آدمی ہمارے معاشرے میں ذرا کم کم چلتا ہے۔ محلے میں شریف آدمی کی اتنی عزت نہیں ہوتی، جتنا کسی غنڈے کے گاڈ پر ہوتا ہے۔ کسی شریف آدمی کا بچہ اغوا ہو جائے تو کسی کونے کدرے میں ایک سطری خبر چھپی تھی لیکن کوئی غنڈا کسی کی

جوان لڑکی کو اغوا کرتا ہے تو اخبارات کی شہ سرخیاں بن جاتی ہیں، اس سماج میں شریف آدمی کو بزدل اور ڈاکو کو جی دار کہا جاتا ہے۔ بلند آہنگی کامرانی کی پہلی سیڑھی سمجھی جاتی ہے۔

احمد سعید کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس کا پی آر نہیں ہے۔ اس زمانے میں تو حکومتیں، ذرائع ابلاغ اور کمونیکشن کے بغیر نہیں چلتیں، بیچارہ ادب کیسے آگے بڑھ سکتا ہے۔ آج کل تو محمد علی کلے کی طرح نعرہ لگانا پڑتا ہے کہ میں گریٹ ہوں، میں عظیم ہوں۔ شروع شروع میں لوگوں کو ایسی باتیں مذاق لگتی ہیں۔ مگر بار بار کہنے سے نعرہ سچ بن جاتا ہے، ہٹلر کا ساتھی گوئبلز تو اس فن کا امام مانا گیا ہے۔ اس کے برعکس احمد سعید کی حیا نے اُسے کارنر کر دیا۔

تیسری خامی یہ ہے کہ احمد

تیسری خامی یہ ہے کہ احمد سعید کسی ادبی رسالے کا ایڈیٹر نہیں ہے ورنہ ادبی بھنورے اس کے چاروں طرف گھومتے، چار دانگ عالم میں ان کا چرچا ہوتا اور اُسے ملک کا اعلیٰ ترین دماغ ہونے کی سند مل جاتی۔

احمد سعید کی چوتھی خامی یہ ہے کہ اس کے پاس کرسی نہیں ہے۔ اچھا ادیب ہونے کے لیے بڑا افسر ہونا بہت ضروری ہوتا ہے آپ کے پاس قلمدان ہے تو آپ ہیچمدان نہیں، ہمہ دان ہیں۔ پھر شہرت ارزاں اور رسد اسدا جوان، احمد سعید تو سائیکل والا ہے۔ سائیکل اور موٹر کی دوڑ کا مقابلہ ہو تو ظاہر ہے ایک طرف خون جلے گا، دوسری طرف پٹرول جلے گا، اور یہ تو ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ پٹرولیم کی صدی ہے۔

پانچویں خامی یہ ہے کہ احمد سعید کا کوئی گروپ نہیں ہے، بھلے آدمی، اکیلے تو خدا اچھا لگتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ رہنا تو ان کے سماج کو قبولنا ہوگا محلے داری کرنی ہوگی، گروپ بنانا ہوگا، گروہ کے ساتھ رہنا ہوگا، بقول بے دل حیدری گروپ کے بڑے فائدے ہیں۔ اگر آپ خوش قسمتی سے

وزیر آغا گروپ کے آدمی ہیں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں کوئی مضمون لکھ لیجیے، یا اداریہ ان کے حق میں توبس پھر پاؤ بارہ ہیں۔ کینو کا کریڈٹ مل جائے گا سیزن میں۔ دوسرا اداریہ لکھیں گے تو کینو کے ساتھ آم کا کریڈٹ بھی۔ مزید آگے بڑھیں ، اداریہ پہ اداریہ لکھتے چلے جائیں، سیزن کے سیزن کنٹرک کی بوریاں بھی آئیں گی۔ اب احمد سعید کو کون سمجھائے کہ بھلے آدمی ذرا ہوش میں آ، اپنا قلم تھوڑا بہت چلا اور کسی دربار کا نورتن بن جا سب بلائیں دفعان ہو جائیں گی اور شہرت کی پریاں لے اڑیں گی !!

احمد سعید کی چھٹی خامی یہ ہے کہ وہ ایک شاندار ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک بڑے ادیب ابو سعید قریشی کا چھوٹا بھائی ہے۔ میں وہ برادر خورد مباش والا محاورہ استعمال نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمارے نام نہاد ادیب جب ابو سعید قریشی جیسے مستند ادیب کو بھول جانے کی حماقتوں میں مبتلا ہوں تو احمد سعید جیسے بے ضرر اور شریف آدمی کو کیسے خاطر میں لا سکتے ہیں یہ ہمارے ادب کا المیہ ہے کہ خاموش کارکنوں کو نظر انداز کیا جائے۔

ساتویں خامی یہ ہے کہ احمد سعید بیمار شمار رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کے رخساروں پر رونق نہیں ہو گی تو ملنے والوں کو آپ کے جیب کے سوراخوں کا ادراک بھی ہو جائے گا۔ پائیدار دوستی کے لیے رخساروں کی چمک بہت ضروری ہے، آپ بڑے ادیب نہ سہی، آپ کا دسترخوان بڑا ہونا چاہیے، لوگ تو غزلیں خرید خرید کر صاحب دیوان بن جاتے ہیں، دسترخوان نے بھی بہت سے لوگوں کو ادیب بنا دیا ہے۔ احمد سعید دل میں سوچتا ہو گا یہ رحیم گل خود بھی بیمار شمار رہتا ہے تو عرض ہے کہ میرا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ میں نے جب سے خاکے لکھنے شروع کیے ہیں لوگ از راہ کرم مجھ سے مسکرا کر ملتے ہیں۔ اب تو محترم اشفاق احمد بھی ہمیں گلے لگانے لگے،

گئے ہیں۔ لوگ ذرا چوکس ہو گئے ہیں کہ بے ڈھب قسم کا پٹھان آدمی ہے پتہ نہیں کس وقت کیا بکواس کرنے بیٹھے۔ چنانچہ اس طرح میں نے بیماری کو صحت میں بدل دیا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ احمد سعید نے چند فلمیں بھی لکھی ہیں۔ پتہ نہیں احمد سعید نے کتنے گلاس توڑے ہوں گے۔ میرا خیال ہے انہوں نے کوئی گلاس نہیں توڑا، اگر یہ گلاس توڑنے کا عمل جاری رکھتے تو فلم انڈسٹری سے باہر نہ ہوتے!!

آپ کہیں گے یہ کیا بات ہوئی تو عرض کروں گا کہ گلاس توڑنا بھی فلم کی کہانی کا ایک حصہ ہے۔ خود میں بیس پچیس سال فلم کا کہانی کار رہا ہوں اور میں نے ان گنت گلاس توڑے ہیں۔ گلاس توڑنے کی یہ روایت مرحوم ضیاء سرحدی سے چلی آ رہی ہے۔ وہ جب فلمی سیٹھوں کو کہانی سناتے تھے اور کلائمکس یا انٹی کلائمکس کا سین آتا تھا تو ہاتھ سے بھرے ہوئے ایک دو گلاس سامنے کی دیوار پر مار کر چکنا چور کرتے۔ فلمی سیٹھ اس ساؤنڈ ایفیکٹ سے بہت متاثر ہوتے تھے اور کہانی ٹیبل پر ہٹ ہو جاتی تھی۔ ضرورت کے وقت کہانی کار کے آنسوؤں کا ٹپکنا بھی کہانی بیچنے میں بہت معاون ثابت ہوتا تھا اور اگر کہانی سناتے وقت آپ نے سیٹھ کے بھی آنسو نکال دیئے تو سمجھو وہیں سلور جوبلی ہو گئی اور سیٹھ کی تجوری خالی ہو گئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ احمد سعید جیسا شرمیلا آدمی ان سب مراحل سے گزرا ہو گا۔ وہ اس پل صراط سے گزر جاتا تو کبھی ادب کی طرف نہ آتا، اور ادب کی طرف نہ آتا تو آج محفل بپا نہ ہوتی تو ایسے خوبصورت لوگوں کو کیسے یکجا دیکھتے۔

بالغ بچّہ

خاطر غزنوی

بالغ بچہ، مگر بے حد ذہین بچہ۔۔۔!

میں نے کسی مضمون میں اسے انسائیکلوپیڈیا بھی کہا ہے۔

یہ بالغ بچہ اردو میں ایم اے ہے مگر پڑھاتا چینی ہے۔

پشاور یونیورسٹی میں چینی زبان کا پروفیسر ہے خود بھی چینی کی طرح بیٹھا ہے اور لگتا بھی چینی ہے ایک بار قصہ خوانی بازار میں کسی دکان میں بیٹھا تھا۔ دکان دار کسی کام سے اُٹھ گیا تو باقاعدہ سودا بیچنے لگ گیا۔ یونیورسٹی کے کسی طالبعلم نے اسے سودا بیچتے دیکھا تو حیران رہ گیا، واپس یونیورسٹی پہنچا تو ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "دوستو! وہ جو ہماری یونیورسٹی میں چینی زبان کا پروفیسر ہے نا وہ تو فر فر اردو بھی بولتا ہے!"

اس پروفیسر کو دنیا خاطر غزنوی کے نام سے جانتی ہے۔

خاطر نفیس آدمی تو ہے ہی مگر وہ بے حد دلچسپ شخصیت بھی ہے۔ اس کے شوق اور مشغلے عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً کیلنڈر جمع کرنا، تاش کے جوکر جمع کرنا، طوطے، بلبلیں اور کتے پالنا، کتابیں، رسائل، فوٹوگرافی، دنیا کے منتخب لوگوں کی تقاریر پہ ریکارڈ کرنا۔

فوٹوگرافی میں تو اسے کمال حاصل ہے. خود تصویر اتارتا ہے، خود ہی ڈویلپنگ اور پرنٹنگ کرتا ہے، پروفیشنل نہیں ہے. مگر پروفیشنل کی طرح ڈارک روم بنا رکھا ہے۔ انلارجر رکھا ہوا ہے، فوٹوگرافی کی تمام باریکیوں اور مین میخ سے واقف ہے۔

پشاور یونیورسٹی کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہتا ہے. جس میں چار پانچ کمرے ہیں، دو طرفہ برآمدے ہیں۔ لیکن برآمدے اور کمرے کتابوں سے اٹے پڑے ہیں، الماریوں میں کتابیں، چارپائیوں، پلنگوں پہ کتابیں، دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابیں، فرش پر کتابیں، ہر طرف کتابوں کے مینار کھڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے چھت دیواروں پہ نہیں کتابوں کے میناروں کے سہارے کھڑی ہیں۔

جس کمرے میں خاطر سوتا ہے وہاں پلنگ کے ارد گرد کتابوں کے ان گنت مینار کھڑے ہیں. خاطر کتابیں اوڑھ کر سوتا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ یہ منحنی سا شخص ان ہزاروں کتابوں سے کس طرح نمٹتا ہوگا!

خاطر اچھا شاعر ہے، بہت اچھا شاعر، لیکن ابھی تک اس کا دیوان نہیں چھپا۔ اس کی وجہ خاطر کی سماجی، تہذیبی اور ادبی مصروفیتیں، وہ کئی خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ اباسین آرٹ کونسل کا وہ اعزازی سیکرٹری ہے۔ انتظامیہ کے علاوہ تقاریب کی دوڑ دھوپ، ریڈیو کے لیے کچھ نہ کچھ لکھنا، ٹی وی سے رابطہ نانا، یونیورسٹی کی سیاست، اپنے لیکچرز کی تیاری، لاہور، کراچی، اسلام آباد، کوئٹہ کہیں بھی کوئی تحریک ہو، کوئی اجتماع ہو، خاطر سرحد کی نمائندگی کرتا نظر آئیگا۔ یہی نہیں، ڈرامہ وہ لکھتا ہے، فکشن وہ لکھتا ہے، پشتو فوک کے تراجم میں بیش بیش، کتابوں پر تبصرے، ادبی پرچے کی ادارت اور فوٹوگرافی سب پر سوار۔

بے چاری شاعری کے لیے وقت کہاں سے نکلے حالانکہ بنیادی طور

پر وہ شاعر ہے اگر وہ اپنی توانائیاں ضائع نہ کرتا اور پوری توجہ شاعری پر دیتا تو اپنے فن میں بے مثال ہوتا۔

خاطر پچاس بچپن سے کم کیا ہوگا۔ اس کی مصروفیات دیکھتا ہوں اور ہزاروں کی تعداد میں کتابوں پر نظر جاتی ہے تو سوچتا ہوں یہ مختصر قد کاٹھ کا آدمی اور منوں ٹنوں کے حساب سے کتابیں گویا کہ کروڑوں اربوں الفاظ کا مفہوم اس کی سانسوں میں رچا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وسعت مطالعہ سے روح بوجھل ہو جاتی ہے یا روح میں گلاب کھل اٹھتا ہے کیونکہ خود میرا تجربہ ہے کہ بعض اوقات اچھی کتاب پڑھ کر انسان سرشاد ہو جاتا ہے مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ انسان شک و شبہات میں گھر جاتا ہے اور آگہی کے اندھیرے اسے پاتال کی سمت ڈال دیتے ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ خاطر میری طرح کی واردات سے دوچار ہوا ہے یا نہیں مگر یہ بات واضح ہے کہ کثرت مطالعہ اور کثرت کار نے اسے منتشر کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ جو مقام اسے ملنا چاہیئے تھا۔ نہیں ملا وہ اب بھی مقام حاصل کر سکتا ہے بس یہ کہ، کہ ایک دو سال کے لیے مکر وہاتِ دنیا کو بھول جائے اور اپنے آپ کو شعر کے لیے وقف کر دے ....؟

یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ خاطر اپنی ذات میں انجمن ہے۔ وہ چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ہے کہ صفحہ الٹو تو نیا مضمون، ورق ورق میں حیرت و استعجاب کا جادو!

مگر اس پر بھی ان کی بیگم کو گلہ ہے کہ یہ جو کتابوں کی مینار یں کھڑی ہیں میرے کس کام کی ...؟

آخری آدمی

انتظار حسین

تنقید کس پر نہیں ہوتی، الزام کس پر نہیں لگتے ... لوگ تو موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

انتظار حسین بھی انہی لوگوں میں سے ہے جن پر دائیں بائیں ہر طرف سے حملے ہوتے ہیں لیکن اس نے "چپ" کی زرہ بکتر پہن رکھی ہے۔ تیر آتے ہیں ٹکراتے ہیں، انتظار حسین پروا نہیں کرتا ... لوگ کڑھتے ہیں اکتا کر چپ ہو جاتے ہیں۔

یار لوگ کہتے ہیں .... انتظار ماضی کے خول میں بند ہے، وہ آگے نہیں پیچھے دیکھتا ہے۔ روز جنازے اٹھتے ہیں۔ روز قبریں کھدتی ہیں، مگر اسے گورستان میانی سے کوئی دلچسپی نہیں ... وہ ہزاروں میل دور نانی اماں کی قبر پر پھول چڑھانے کے لیے تڑپتا ہے۔

انتظار حسین کے پاس سیدھا سادا جواب ہے .... وہ اپنی فکر پر پہرے بٹھانا پسند نہیں کرتا .... جیسے سوچتا ہے ویسے کرتا ہے ... جو جذبہ اکساتا ہے اس پر لکھتا ہے .... لوگ اپنے تجربوں پر کام کرتے ہیں وہ اپنے تجربوں سے آگے بڑھنے کا قائل ہے ... رویہ ٹوپی

تو نہیں کہ ایک اتار لی دوسری سر پہ رکھ لی ... ادب میں حکم کیسا.... ؟ احساس پہ قینچی کیوں.... ؟ خون کی روانی پہ قدغن کیا معنی ... ؟ وہ جیسا ہے ٹھیک ہے۔

مگر ایک صاحب بولے .... "انتظار حسین کو تاریخ کے جبر کا احساس تو ہوگا ہی، بغداد کا کیا حشر ہوا، دہلی کتنی بار لٹی۔ انسانی کھوپڑیوں کے مینار کس نے چنے۔ عصمتیں کیوں لٹیں، بار بار کیوں لٹتی رہیں۔ معصوم بچوں کو نیزوں میں کون پروتا رہا۔ ؟"

ایک اور صاحب بولے ... "تاریخ کا جبر آتا ہے تو سرحدیں بکھر ہی جاتی ہیں۔ جغرافیے بدل جاتے ہیں۔ پینگیں ٹوٹ جاتی ہیں اور آم کے پیڑوں کے بور بارود سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔.... ؟"

تیسرا بولا... تاریخ کے اکھاڑ پچھاڑ کی کہانی کون نہیں جانتا ... جو جہاں پہنچ گیا وہیں خیمہ گاڑ دیا.... بات صرف سمجھنے کی ہے، حوصلے کی، پیڑ اگانے کی، پیڑ اُگ جائے گا تو برکھا رت بھی آجائے گی۔ پینگیں بھی تن جائیں گی اور ساون کے گیت بھی مہک اُٹھیں گے....

چوتھا بولا... "لکیر پیٹنے سے فائدہ ... لکیر کو گہرا کر دو ... لکیریں بیج ڈال دو۔ پھر آب و گل کے اختلاط کا تماشہ دیکھو.... !

پانچویں نے کہا .... ماضی ایک منجمد شعور ہے۔ اس سے دو چار تنکے اٹھاؤ اور آگے بڑھ جاؤ۔ زندگی انحطاط کا نہیں ارتقاء کا نام ہے۔"

چھٹے نے کہا.... کیا ایسا ہونا چاہیئے ؟ بند گلی کا گھر کتنا ہی محفوظ ہو راستہ صرف ایک ہوتا ہے اور یہی اس کی خرابی ہے۔ ہوا کے بھی دو راستے ہوتے ہیں۔ آنے کا راستہ، نکل جانے کا راستہ۔ پانی کو بھی بہتا رہنا چاہیئے رک جائے گا تو آلودہ ہو جائے گا، گندہ ہو جائے گا.... ؟"

مگر مَیں سمجھتا ہوں یہ سب بے کار ہے۔ کوئی بھی کسی کے کہنے پر نہیں

چلتا۔ کوئی مسجد جاتا ہے، کوئی مندر جاتا ہے، کوئی گرجا جاتا ہے، ہر آدمی کا اپنا راستہ ہے۔ انتظار حسین کا سفر بھی اپنا سفر ہے۔ وہ اپنی بستی میں جائے گا۔

قدیم کہانیاں، قدیم دانش کی امین ہیں۔ مگر یہ دانش ہر عہد کے لیے ایک نیا اور تازہ روپ لے کر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کہانیاں بعض نئے فنکاروں کے لیے اپنے زمانے کی ابتری کی تصویر کشی کے لیے ایک وسیلہ بن گئی ہیں۔ ہمارے زمانے کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین نے ان کہانیوں کی اس طاقت کو اس طرح پہچانا ہے کہ یہ کہانیاں ان کے لیے ایک گہرا روحانی تجربہ بن چکی ہیں۔ قدیم تہذیبوں کی بھید بھری کہانیوں کے حوالے سے قدیم تہذیبی منطقوں میں انتظار حسین کا فنی سفر جدید اردو افسانے کی مملکت کی حدود کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کر رہا ہے۔ اپنی بستیوں کی کہانیاں بیان کرتے کرتے انتظار حسین قدیم تہذیبوں کی پر اسرار بستیوں میں جا نکلے۔

اور اب ایک نگر سے دوسرے نگر کی طرف ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی خبر۔

انتظار حسین اچھا افسانہ نگار ہے۔ صفِ اوّل کا افسانہ نگار۔۔۔۔ وہ اندر کی بات کرتا ہے۔ وہ اپنے بطون میں رہتا ہے۔۔۔ اپنے آپ میں۔

یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانے میں خارجی عوامل کم کم ہوتے ہیں۔ بلکہ سرے سے ہوتے ہی نہیں۔

اس کا یہی رویہ اس کی مجلسی زندگی میں بھی جھلکتا ہے۔ وہ سہیل احمد خان سے آگے نہیں بڑھتا اور ناصر کاظمی پر اس کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔

عالمی ادب میں وہ صرف ایک نام لیتا ہے، روسی لکھاری (چیخوف) بس وہ حتمی ہے۔ وہی پہلا وہی آخر۔

روسی ادیب نے جو قاعدے کلیئے بنا رکھے ہیں، بس وہی آخری سنگ میل ہے۔ اس کے طے شدہ اصولوں کو جو آدمی نظر انداز کرے گا وہ فکشن نہیں لکھے گا، جھک مارے گا۔۔۔!

انتظار حسین اچھا لکھنے والا ہے۔ لیکن جس قاعدے کلیے کا وہ ذکر کرتا ہے خود انتظار حسین کو اس پر پرکھا جائے تو نتیجہ بے حد صبر آزما ہوگا۔

انتظار حسین ایک مخصوص دائرے کے اندر زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔ وہ اچھائی نہیں کرتا، برائی بھی نہیں کرتا۔ جسے برا سمجھتا ہے اس کی برائی بھی نہیں کرتا۔۔۔۔

ایک طرح سے اس کا یہ بڑا پن ہے کہ وہ جیسا ہے، ویسا رہے، اس میں قطع اور اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھتا۔۔۔

کوئی بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس کی بلا سے، کوئی پیچھے رہ گیا ہے تو بھی اسے پروا نہیں۔ کسی کی ترقی کسی کا زوال انتظار حسین کے پرابلم نہیں۔

البتہ شہر میں درخت کٹتا ہے تو انتظار حسین کے دل پر آرا چلتا ہے۔ پھولوں کی کیاری ویران ہوتی ہے تو انتظار حسین احتجاج کرتا ہے۔ ساون آتا ہے، تو آموں کا ذکر، جاڑا آتا ہے تو چلغوزے اور ریوڑی کا تذکرہ لازمی ہے۔

انتظار کثرت اولاد کی طرح کثرت احباب کا بھی قائل نہیں ہے۔۔۔ اسے پروا نہیں کہ دوست کتنے ہیں اور دشمن کتنے۔۔۔۔

وہ محاذ نہیں بناتا۔ اس لیے پسپائی سے خائف نہیں؟ کسی انجمن ستائش باہمی کا بھی ممبر نہیں اور نہ ہی گروپ بندیوں اور گروہ بندیوں پر یقین رکھتا ہے۔

اس دور میں ہر آدمی کے دو چہرے ہیں۔ ایک پیار کرنے والا، دوسرا نفرت کرنے والا۔ ایک ہنستا ہوا، دوسرا روتا ہوا۔ ایک بلیغ و فصیح دوسرا

چیچک زدہ، ایک نظر آنے والا دوسرا نظر نہ آنے والا۔
لیکن انتظار حسین کا صرف ایک چہرہ ہے۔
اس میں اگر پیار نہیں، تو نفرت بھی نہیں۔
یہ خشک چہرہ ہے، جذبات سے عاری چہرہ، مہر سے عاری چہرہ...
چھل دل سے عاری چہرہ.....!
مگر میرے نزدیک یہ ایک شاندار چہرہ ہے کہ اس کا صرف ایک ہی روپ ہے...!!

ایوانِ ادب میں براجمان
لوگوں کے خاکے تو ہر
کوئی لکھتا ہے فٹ پاتھ
پر بیٹھنے والوں کے
خاکے کون لکھے گا ؟

مقبول خان مقبول

امیر ابنِ امیر سے مجھے اس لیے پرخاش نہیں ہوتا کہ جب فطرت ہی غلط بخشی پر بضد ہو تو بے کار کڑھنے سے فائدہ اور غریب ابن غریب کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ مٹی چاٹ کر بھی جینے کے لئے کلبلاتا ہے اور فطرت کی ستم ظریفیوں کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

اور فطرت کی نیرنگیوں کی یہ ادا بھی قابل غور ہے کہ وہ پتھر میں کیڑے کو روزی پہنچاتا ہے۔

مقبول خاں مقبول ان لوگوں میں سے ہے فٹ پاتھ سے رزق حاصل کرتے ہیں۔ مگر مقبول کا رزق ان گداگروں کا رزق نہیں جو جھوٹ موٹ آنکھیں نیچے کر کے چادر بچھا دیتے ہیں اور شام تک چالیس پچاس روپے بٹور لیتے ہیں۔ ان مداریوں کا رزق بھی نہیں جو طوطوں سے توپ چلا کر دہلی کے لال قلعہ پہ فتح کا پرچم لہراتے ہیں۔

مقبول خاں تو سیدھا سادا محنت کش ہے، جو فٹ پاتھ پر نایاب اور

خوبصورت کتابوں سے علم کشید کرتا ہے وہ ایک انوکھا فٹ پاتھیا ہے جو پرانی کتابوں کے توسط سے نیا مکان تعمیر کرتا ہے، دسترخوان بچھاتا ہے اور خیال و فکر کی روشنی سے اپنا سینہ منور کرتا ہے۔

لوگ تو بڑی بڑی لائبریوں کے باوجود بانجھ رہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ فٹ پاتھیا کرم خوردہ کتابوں میں سے جیون جیوتی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ میں نے ان کی نثری نظمیں پڑھی ہیں۔ ان کی زبانی بھی سنی ہیں۔ ایک دوبار ویگن میں شریک سفر ہوئے تو وہاں بھی ان کی نثری نظموں کی زد میں آگیا تھا۔

تب مجھے مرحوم ایم اسلم اور مرحوم عبدالمجید بھٹی یاد آگئے، جو مرغن غذائیں کھلا پلا کر بولتی بند کر دیتے ہیں اور ناولوں کے باب سنا سنا کر بھوم نکال دیتے تھے۔ مگر مقبول خاں کا حملہ چلتی ویگن میں ہوا تھا۔ یہ حملہ ایک ایسے شخص پر ہوا تھا جو جسمانی طور پر سفر میں ہو تو ذہنی طور پر بھی سفر میں ہوتا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا کہ اے جی آفس میں اترنا ہو تو میکلوڈ روڈ پر اتر گیا۔ میکلوڈ روڈ میں اترنا ہوا سٹیشن پر پہنچ گیا۔

اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ میں کسی مضمون کی تلاش میں ہوتا ہوں یا کسی کا خاکہ لکھ رہا ہوتا ہوں ایسے میں مقبول خاں کی بات کون سنتا ہے؟

لیکن یہ اتفاق نہیں واقعہ ہے کہ مقبول خاں نے کھلائے پلائے بغیر میرا استغراق توڑا ہے ان کی زبان سے اچانک ایسا مصرعہ نکلا جیسے اندھیرے میں جگنوں چمکا ہو اور میں چونک کر اس فٹ پاتھیے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا جس نے عمر کے آخری دور میں شاعری کی ابتدا کی یعنی جب لوگ خالی الذہن ہو جاتے ہیں۔ ریٹائر ہونے کا سوچتے ہیں۔ مقبول خاں نے شاعری کا آغاز کیا۔

دو سال پہلے میں نے واقعی مقبول خاں کا نام نہیں سنا تھا تو پھر کہا جا سکتا ہے۔ لٹریچر میں مقبول خاں کا کیا مقام ہے کہ ان کا خاکہ بھی لکھا جائے

میرا جواب یہ ہے کہ ایوانِ ادب میں براجمان لوگوں کے خاکے تو ہر کوئی لکھتا ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والوں کے خاکے کون لکھے گا۔

جو لوگ ادبی رسائل کے ایڈیٹر نہیں ہیں اور روزناموں کے ادبی صفحات کے انچارج بھی نہیں ہیں اور گروپ بندیوں کا یارا نہیں رکھتے اور انجمن ہائے تحسین باہمی کے ممبر بھی نہیں ہوتے ان لوگوں کو داد کون دے گا۔؟

یہ ادبی اور اخلاقی بددیانتی کی انتہا ہے کہ جو نہیں ہے اسے مجسم کر دو اور جو ہے اسے معدوم کر دو۔ آج سے تین چار سو سال پہلے خوشحال خان خٹک نے بھی یہ رونا رویا تھا وہ ایک شعر میں کہتا ہے ؎

پښتانہ لکہ مگس دربا ندے گرزی
ورقہ ریځنے دی مغل. د حلوا تال دے

مغلوں نے حلوے کا تھال سجا رکھا ہے اور پشتون خان خواتین اس تھال پر مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی ہیں اب بھی یہی حال ہے۔ شرفا کے لشکر کے لشکر حلوے کے تھال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایسے میں اقبال ساجد کی شاعری کا کیا ذکر اور مقبول کی نثری نظموں کی کیا حیثیت۔

مقبول خاں کے ساتھ شام منانے والے لوگ بھی مجھے اس دنیا کی مخلوق نظر نہیں آتے اور خود میں جو مقبول خاں پر مضمون پڑھ رہا ہوں۔

اس کے باوجود میں کہنا چاہوں گا کہ زندگی میں جس شخص نے اپنے بچوں سے محبت کی وہ شاعر ہے، جس نے محنت سے روزی کمائی وہ شاعر ہے، جس نے ہاتھ نہیں پھیلایا وہ شاعر ہے۔ جس نے زندگی میں ایک بھی خوبصورت فقرہ کہا وہ شاعر ہے، جس نے اپنے آنگن میں ایک پھول بھی اگایا وہ شاعر ہے، ضروری تو نہیں ہوتا کہ آدمی غالب اور اقبال ہی ہے۔ عدم اور ناصر بھی تو شاعر ہی تھے۔

مقبول خاں بھی اپنے لہجے کا شاعر ہے جو کچھ اس نے کہا ہے خود اسی

کا ہے وہ نہ ہوتا تو کوئی اور وہ بات نہ کہتا وہ جتنے جسامت اور چہرے مہرے سے پٹھان لگتا ہے۔ خو بو سے بھی پٹھان لگتا ہے۔ مستقل مزاج آدمی ہے، کئی بار اجڑا، کئی بار بسا مگر ہار نہیں مانتا۔

ایک بار میرے گھر آیا میں بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ ٹی وی پر ویسٹ انڈیز اور بھارت کا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ ریڈیو گود میں تھا۔ ریڈیو سے پاکستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ کمنٹری سن رہا تھا اور وقفے وقفے سے اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ ایسے میں خاں صاحب آئے اور جیب سے مضمون نکالا، میں چونکا اور سوچا ایم اسلم اور عبدالمجید بھٹی تو کھلا پلا کر مارتے تھے مقبول خاں کھا پی کر مارے گا، لہذا میں نے ٹال دیا۔

لیکن دس منٹ کے بعد پھر مضمون نکالا اور فرمایا "صرف دو صفحے ہیں عرض کیا: مضمون پر توجہ نہ دے سکوں گا"

خاں صاحب نے معذرت کی، مضمون واپس جیب میں ڈال لیا لیکن آدھ گھنٹہ کے بعد کرکٹ کا میچ بریک ہو گیا تو خاں صاحب نے پھر سے مضمون نکالا۔

غریب خانہ حاضر ہے۔ لیکن بصورت دیگر حنیف بھٹو کا حق ان ہی کے لیے محفوظ رکھ لیجئے ـــ والسلام۔

❁❁

رات کا راہی
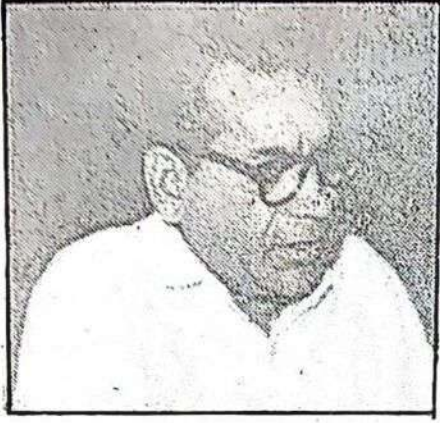
احمد راہی

اگر کوئی کہے ...... خدا ایک ہے تو ایک آدمی اس پر شک کر سکتا ہے!
اگر کوئی کہے "آج سورج مشرق سے طلوع ہوا ہے" تو آواز آئے گی
نہیں...... سورج تو ہمیشہ مغرب سے نکلتا ہے۔
اگر کوئی رات کو رات کہے تو وہ دن کہنے پر مصر ہوگا. دن کو دن کہنے پر
وہ فوراً "ٹوکے گا ..... "چھ ماہ کی مسلسل رات کو تم دن کیسے کہتے ہو۔؟"
اگر کوئی کہہ دے ...... "تم احمد راہی ہو"
تو وہ فوراً "تردید کرے گا ..... میرا نام امام دین ہے!"
میرا خیال ہے جب وہ ماں کی کوکھ سے جنم لے رہا ہوگا۔ اس نے تب
بھی احتجاج کیا ہوگا ..... "نہیں، ابھی نہیں!"
دراصل وہ پیدائشی اپوزیشن کا آدمی ہے۔
وہ اس دنیا میں کسی سے متفق نہیں ہوتا۔ اس بھرے سنسار میں وہ تنہا ترین
آدمی ہے......
وہ اندر سے پکا مسلمان ہے لیکن بظاہر ترقی پسندوں کے ٹولے کا آدمی
گنا جاتا ہے۔ ماہ رمضان میں شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا، نہایت اہتمام اور
مستقل مزاجی سے تیس کے تیس روزے رکھتا ہے لیکن عید کا چاند نظر آتے
ہی آخری روزہ شراب سے افطار کرتا ہے۔
پھر سال کے باقی گیارہ مہینے احمد راہی کی بادشاہت ہوتی ہے۔
چھ سات برس ہوئے احمد راہی مر چکا ہے، اگر زندہ ہے تو بھی میرے

لیے مر چکا ہے۔ کیونکہ اس عرصہ میں ہماری لڑائی نہیں ہوئی، ہاتھا پائی نہیں ہوئی، ایک دوسرے کا گریبان چاک نہیں کیا، اور ایک دوسرے کے گلے نہیں ملے۔

واہ ... کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم لڑ پڑتے تھے، لڈو کھیلتے تھے میں نے اس کی گیٹی ماری .... اس نے چیلنج کیا اور میدان کارزار گرم ہوگیا ...

ایک بار پاکستان اور بھارت کا فائنل ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ احباب ریڈیو کے گرد جمع تھے، پاکستان کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اچانک احمد راہی آگیا اور حسب عادت بولا ....

"چھوڑو کمنٹری، بھارت جیت جائے گا۔!"

اور لوگ تو خاموش رہے، میں نے تڑک سے جواب دیا۔

"تب تم خوشی میں حلوہ بانٹ دینا۔"

پتہ نہیں وہ کیسا منحوس لمحہ تھا پاکستان پر گول ہوگیا، ہم فائنل ہار گئے۔ ہمارے چہرے دیکھ کر احمد راہی نے قہقہہ لگایا .... میں نے اسے للکارا .... جنگ شروع ہوگئی، اس نے مکا مارا، میں نے تھپڑ مارا، جب تک بیچ بچاؤ ہوتا، میں نے اس کا کرتہ پھاڑ دیا، اس نے میری بوشرٹ لیرہ لیرہ کر دی۔ اس شام ہم دونوں بنیانوں میں اپنے اپنے گھر پہنچے، لیکن کیا آدمی تھا احمد راہی، اگلے دن آمنا سامنا ہوتا تو مسکراتا ہوا گلے ملتا۔ میں اس سے معافی مانگتا، وہ مجھ سے معافی مانگتا، یہ روز کی لڑائی تھی، روز کی آشنائی تھی۔ بیس سال تک ہم نے روایت برقرار رکھی، وہ بے حد انا پرست امرتسری اور میں انتہائی روایت پسند سرحدی!

یہ چھوٹی انا کی جنگ ہوتی تھی، ورنہ ہم واقعی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ....

ایک بار شراب کے نشے میں گرفتار ہوا تو پورا تھانہ سر پر اٹھا لیا، گرفتار

کرنے والے پریشان، کہ کس بلا کے آدمی سے واسطہ پڑا ہے ... میڈیکل معائنے کے لیے ٹانگہ منگوایا، ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے، احمد راہی نے جانے سے انکار کر دیا ....

"میں سرکاری ٹانگے میں نہیں بیٹھوں گا۔"

خدا جانتا ہے اس اڑیل آدمی کو کن کن حیلوں بہانوں سے ٹانگے پہ بٹھایا ڈاکٹر کے ہاں پہنچے، آدھی رات کا وقت تھا، ڈاکٹر بور بیٹھا تھا، اس نے سر اٹھائے بغیر پوچھا ... "آپ کا نام؟"

"احمد راہی .... راہی نے جواب دے کر ہونٹ بھینچ لیے۔

"باپ کا نام ...؟" ڈاکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

راہی نے جواب دیا ... "شراب میں نے پی ہے میرے باپ نے نہیں پی!"

ڈاکٹر نے سر اٹھا کر غصے سے دیکھا ... "دیکھو مسٹر! میں سرکاری ملازم ہوں یہ مذاق پسند نہیں کرتا۔"

احمد راہی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ... "میں بھی مذاق پسند نہیں کرتا کیونکہ میں بھی سرکاری ملازم ہوں!"

ڈاکٹر ہنس پڑا اس نے رپورٹ لکھ بھیجی۔

"احمد راہی نے شراب نہیں پی، وہ نشے میں نہیں ہے۔ ہوش و حواس میں ہے۔" ان دنوں ریاض احمد راجو، میں، احمد راہی، راجہ حفیظ (کرکٹ کھلاڑی) اور خلیل قیصر مرحوم روزانہ شام کو اکٹھے ہوتے یہ لوگ شراب پیتے، میں حرغہ کھاتا نشے میں احمد راہی نہایت کاٹ دار فقرے چست کرتا۔ خلیل قیصر مرحوم کی عادت تھی شراب پی کر چپ ہو جاتا اور پھر چپ ہی رہتا، احمد راہی اسے کہتا ...

"خلیل قیصر تم بہت کمینے آدمی ہو، شراب پی کر بھی تم سچ نہیں کہتے ...!"

"ترنجن" کا مصنف اور اس زمانے کے "ادبِ لطیف" کی ادارت کرنے

والا احمد راہی عام زندگی میں بے حد سوبر آدمی ہے۔ بے حد تپاک سے ملنے والا، بے حد احترام دینے والا، نشے کی حالت میں بھی شائستگی نہ چھوڑتا تاوقتیکہ کوئی ذومعنی فقرہ اسے ڈسٹرب نہ کرتا
احمد راہی کا رنگ گندمی ہے۔ ناک قدرے چپٹی، جوانی میں پریم ناتھ سے کافی مشابہت تھی۔ ہم اسے پریم ناتھ کہتے تو خوش ہوتا تھا۔
"جی دار آدمی ہے، شاہ خرچ آدمی ہے، جیب میں پیسے ہوں تو بخل سے کام نہیں لیتا .... غصہ ور آدمی ہے لیکن عالی ظرف آدمی ہے۔ اس کی فطرت میں کمینگی کا شائبہ تک نہیں ہے۔
مانگ تانگ کی عادت نہیں، جیب خالی ہو تو دوستوں کا سامنا نہیں کرتا، بھوکا ہو پھر بھی ہاتھ نہیں پھیلائے گا.... بعض لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں مگر آنکھ کی بھوک نہیں جاتی، احمد راہی کا پیٹ خالی ہو مگر آنکھوں کی تونگری قائم رہتی ہے۔
فقر و غنا کا نشہ بھی خوب ہوتا ہے!
احمد راہی نے فلم میں، ادب میں خوبصورت شاعری کی ہے، خوبصورت نثر لکھی ہے وہ اب بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ایک وسیع میدان اس کے سامنے تھا، مگر برا ہو عشق ناہنجار کا، احمد راہی ایک ایسی بیوی کے ہتھے چڑھ گیا جو اس کے مقام سے آشنا نہ تھی، جو اس کی شاعرانہ تعلی کو سمجھنے کی استعداد نہ رکھتی تھی، جو اس کے غصے کے نکاس میں معاون ثابت نہ ہوئی جس نے احمد راہی کی سرکشی کو احترام نہ دیا اور جس نے احمد راہی کی فطری اپوزیشن والی شخصیت کی سرشت کو کچل ڈالا....
کہیں کا نہ رہا احمد راہی، بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا ہے وہ، نہ آتی یہ عورت نہ مرتا احمد راہی!
کتنا عجیب لگتا ہے، زندہ آدمی کا نوحہ ....؟
وہ میرے لیے سات سال سے مر چکا ہے!
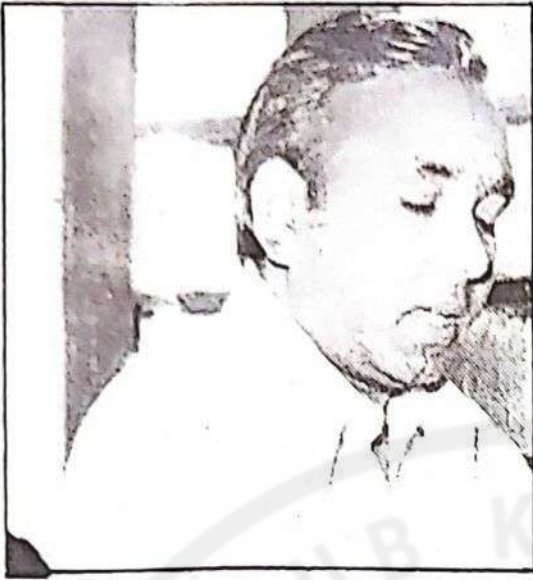
فتنہ

گلزار وفا چوہدری

ایک روایت ہے، سارے لمبے بے وقوف ہوتے ہیں، سوائے عمر رضی اللہ عنہ کے، سارے چھوٹے فتنے ہوتے ہیں۔ سوائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے۔ اس پیمانے پر جب گلزار وفا چوہدری کو دیکھتا ہوں تو روایت سچی لگتی ہے۔ مگر میں یہ کہہ کر اُس کا قد نہیں بڑھانا چاہتا کہ چار فٹ ساڑھے چار انچ کا یہ اسکیمو اتنے ہی قد کے ساتھ زمین کے اندر بھی موجود ہے۔ گلزار کے ہاتھ بچوں جیسے چھوٹے چھوٹے مُنّے مُنّے مگر عملاً اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ ہر شنید پر بے پناہ حیرتوں کا اظہار جیسے یہ بالغ بچہ ابھی ابھی ماں کی کوکھ سے نکلا ہے اور دنیا کی ساری دانش سمیٹنے کے درپے ہے۔ لیکن جب یہ لوگوں کے خاکے اڑاتا ہے تو انگوٹھا چوسنے والا یہ گلیکسو بے بی اپنی پختہ کاری سے بڑے بڑوں کو انگشت بدنداں کر دیتا ہے۔ سنا ہے ماں عیسائی اور باپ کرسچئین ہے۔ خود بھی کرسٹان ہونے کا داعی ہے، مگر خوبو کٹر مسلمان کی سی ہے۔ میرا خیال ہے عطاء الحق قاسمی کی دوستی نے اس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ سانڈوں کے پائے کھلا کھلا کر اس نے حضرت عیسیٰ کی بھیڑ کو ٹارزن بنا دیا ہے کہ بائیں رخسار پر طمانچہ کھانا ہے تو دایاں رخسار آگے نہیں کرتا بلکہ مقابل کے پیٹ میں خنجر بھونک دیتا ہے۔

یہ اسکیمو وہیل مچھلی سے کم کے شکار پر راضی نہیں ہوتا! اب تک

بہت ساری دیل مچھلیاں ڈھیر کر چکا ہے لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ نسل کشی ہے مگر اپنا خیال ہے کہ دازنگاری کردار کشی کے ضمن میں نہیں آتی اور نہ ہی خوبیوں اور عیبوں کی نشاندہی نسل کشی کہلاتی ہے۔ سانولے رنگ کا گلزار وفا سلونے ذہین کا بے طرارہ لکھاری ہے ایسے تیکھے وار کرتا ہے کہ ایک بار تو وار کھانے والا بھی زیر لب مسکرا دیتا ہے مگر کمال یہ ہے کہ زخم کا نشان نہیں ہوتا، ٹیس برابر اٹھتی ہے۔ فقرہ کیا کستا ہے۔ "حمد بھائی کا چاقو چل جاتا ہے۔ گلزار نے بے حد تیکھے مگر بیلنس اور خوبصورت خاکے لکھے ہیں۔ سوائے ان چند خاکوں کے جن سے جانبداری کی بدبو آتی ہے۔ قصیدہ یاریں خندگل کی بات کہاں۔ قاری تو عیب وہنر کی نازک کلیوں کے چٹخنے سے محظوظ ہوتا ہے۔

پیشہ بچوں کو پڑھانا ہے۔ بچوں میں بچہ لگتا ہے۔ مگر چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق بچے اس کی بات مان جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ نشانِ عظمت کی وہ گول چندیا ہو جو بچوں کے اپنے سروں پر نہیں ہے!؟

صحافت اور ادب سائیڈ بزنس ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ سائیڈ بزنس ہی اصل سرچشمہ ہے۔ استادی شاگردی تو محض اُستادی ہے! شکل سے بے حد معصوم آدمی لگتا ہے۔ لیکن معرکہ آرائی سے زندگی عبارت ہے۔ جسمانی طور پر کمزور آدمی ہے۔ اس لیے زیادہ تر مار ہی کھاتا ہے۔ لیکن اس سیاہ کمبل کا کمال یہ ہے کہ بے چارہ مارنے والا ہی اس بلائے بے درماں کے پنجوں میں تڑپتا ہے اور راہ فرار بھول جاتا ہے جب بھی ملتا ہے گلے لگ کر ملتا ہے۔ کمزور آدمی مضبوط بانہوں میں آتا ہے تو اس کی ہڈیاں چٹخانے کی تحریک ہوتی ہے۔ پھر خیال آتا ہے۔ اقلیت کا سہی مگر ہے تو آدمی۔ یوں وہ میری فطرت کی شوخی کی زد میں آکر بھی صحیح سلامت نکل جاتا ہے مجھے آج تک اس پر غصہ نہیں آیا کبھی آیا بھی تو شاید ہی کچھ کہہ سکوں، میرا خیال ہے یہ شوخ بچہ نفرت کے نہیں پیار کے لائق ہے۔

لا تعلیق آدمی

ڈاکٹر آغا سہیل

ایک بار ڈاکٹر وحید قریشی نے مجھ سے کہا: تم اکثر جونیئر لوگوں کے خاکے لکھتے ہو؟"
عرض کیا ... "اس لیے کہ میں بزرگوں سے گستاخی نہیں کر سکتا۔"
ایک اور صاحب نے کہا ... "آپ ڈاکٹر وزیر آغا کا خاکہ لکھیں۔"
عرض کیا ... "ان کے باغ کے سارے "کینو" سلمان بٹ کھا جاتا ہے خاکہ بھی وہی لکھیں گے! فرمایا ... آپ رشوت لے کر خاکے لکھتے ہیں
عرض کیا ... ہاں ... میں محبت کی رشوت کا بھوکا ہوں۔ جس کے دامن میں محبت نہیں ہے۔ میرے پاس ان کے لیے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں!
ایک اور صاحب نے کہا ... "ڈاکٹر انور سدید خاکے کے لیے موزوں آدمی ہیں۔"
عرض کیا ... "صرف موزوں نہیں، موزوں ترین آدمی ہیں، بس موڈ کا انتظار ہے۔"
ایک صاحب نے کہا ... "ڈاکٹر آغا سہیل کا خاکہ لکھیں ..."
عرض کیا ... "میں شریف آدمی کے خاکے نہیں لکھتا!"
لیکن آج میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا ہوں۔ اپنے آپ کو آزمائش میں ڈال رہا ہوں اور اس شریف آدمی کو خاکہ بند کر رہا ہوں۔
ڈاکٹر آغا سہیل ڈاکٹر ہیں، ایم بی بی ایس نہیں، لٹریچر کا، بچوں

کو پڑھاتا ہے ..... سکول میں نہیں کالج میں۔"
چھوٹا قد، بڑا ذہن، گھنے بال، گورا رنگ۔
بتیسی نے کام بگاڑ دیا۔ ورنہ خوبصورت آدمی ہوتا، پھر بھی خوبصورت آدمی ہے .....
مرنجاں مرنج، بذلہ سنج، خوش مزاج، خوش گفتار، بس چلے تو اچھائی کرتا ہے۔ مگر بس چلے تو برائی نہیں کرتا۔ اچھا دوست ہے، اچھا آدمی ہے، اچھا شوہر ہے، اچھا باپ ہے، اچھا استاد ہے، اچھا افسانہ نگار ہے، اچھا تنقید نگار ہے اور تنقیدی اجلاسوں کا اچھا صدر ہے۔
دودھ اور پانی کی مقدار کو سمجھنے والا،
پانی کہاں مرتا ہے اس کا شعور رکھتا ہے،
بات کا سمیٹنا جانتا ہے، بات کو آگے بڑھانا بھی جانتا ہے،
چونکہ نستعلیق قسم کا آدمی ہے، مہذب اور شریف، ظاہر ہے ہمارے ادب میں شریف آدمی ذرا کم کم چلتا ہے۔ بلکہ کارنر کر دیا جاتا ہے، اس کے باوجود آغا سہیل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے، ادبی حلقوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ادبی پرچوں میں بھی نظر آتا ہے۔
لوگ اسے سلام کرتے ہیں، پیار بھی کرتے ہیں۔ مگر کوئی کمی ہے جس کا ڈاکٹر کو ادراک ہوا ہے .....
کچھ چھیڑ چھاڑ کا شوق، دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کا عمل،
کچھ عرصے سے محسوس ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر مصلحت اندیشی کے خول سے نکل آیا ہے۔ گو یہ نکلنا عاقبت اندیشی کے حدود میں نہیں آتا، البتہ یہ "سچ" کے قریب ہونے کا کوئی عمل ہے ..... سچ کہنے میں ہمیشہ مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آدمی نستعلیق بھی نہیں رہتا۔
آغا سہیل بھی ان دنوں ایسے ہی مرحلے سے گزر رہا ہے، وہ سچ کہہ رہا

ہے اور اس کے دوستوں میں کمی آ رہی ہے۔

جوں جوں اس کی تنقید میں گہرائی آتی جا رہی ہے توں توں اس کی پذیرائی میں کمی آ رہی ہے۔

آجکل وہ امتحان دے رہا ہے، نصاب کا نہیں، رویوں کے تعین کا کچھ عرصہ پہلے وہ محتاط تھا، کتاب پر رائے دینے سے پہلو تہی کرتا، صاحبِ کتاب کے اوقات کو دیکھتا، قدو قامت کو، ادبی جسامت کو اگر بندہ لندھور ہے اور کتاب لنڈوری، تو گول کر جاتا، محفل میں نہ آتا، بعد میں معذرت کرتا، ... موسم شدید تھا، سکوٹر ورکشاپ میں تھا، تاریخ بھول گیا تھا، وقت یاد نہیں رہا تھا، حافظہ کمزور ہو گیا ہے ... وغیرہ وغیرہ۔

شریف آدمی، لوگ اس کی بات کا یقین کر لیتے تھے ... لیکن جب بار دگر، بار دگر یہ عمل جاری رہا تو لوگوں کو شک ہو گیا ... اور پھر ظاہر ہے، شک کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا!

ڈاکٹر کب تک پہلو تہی کرتا، بالآخر میدان میں آ گیا ...

مرد میدان بننے کے لیے بڑے استقلال کی ضرورت ہوتی ہے، تھپیڑوں کا سا کرنا پڑتا ہے۔ اٹل رہنا پڑتا ہے ...

برے کو برا کہنا اتنا مشکل نہیں ہوتا، جتنا اچھے کو اچھا مان لینا، اس کے لیے بڑے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے ...

اور ڈاکٹر نے اس کا ثبوت دیا، اس نے بیچ محفل میں وہ کچھ کہا جو لوگ پس پشت کہتے ہوئے بھی کتراتے ہیں۔

یہ بڑے دل گردے کی بات تھی ...

ڈاکٹر نے پچھلے چند مہینوں میں کتابوں پر جتنے مضامین پڑھے بہت متنازعہ تھے ... متنازعہ اس شکل میں کہ لوگوں نے تالی بجائی مگر صاحب کتاب کی آنکھوں میں دھند آ گئی۔

ایک طرف پسندیدگی، دوسری طرف آزردگی۔
جنہوں نے سُنا، خوش ہوئے، جنہوں نے پالیا، پشیمان ہوئے،
عذرا اصغر ناراض ہوئی تو اظہر جاوید بھی گئے۔۔۔ ڈاکٹر نے
بیک وقت دو ردعمل دیکھے، ایک داد و ستد کا، دوسرا شکوہ شکایت کا،
وہ ایسے دوراہے پر کھڑا ہے کہ ایک طرف سچ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔
دوسری طرف مصلحت کا،۔۔۔ کوئی ہم جیسا ہوتا تو آگے بڑھ جاتا اور
وہ کر گزرتا جو اس کا وجدان کہتا، مگر ڈاکٹر با شعور پروفیسر ہے۔۔۔۔
دیکھتے ہیں رکتا ہے یا آگے بڑھتا ہے بہنے والے پانی اور رک جانے والے
پانی کا فرق تو بہرحال ڈاکٹر کو معلوم ہے۔
دوست بنانا اور دوست گنوانا بھی آجکل ایک فن ہے۔
یہ دور جا رہا ہے کہ لوگ بہت سوچ کر دوستیوں کے بیج بوتے
ہیں پھر پودے کو سینچتے ہیں، درخت بن جاتے ہیں تو اس کے سائے میں
بیٹھتے ہیں، اس کا ثمر کھاتے ہیں اور دوستوں کے گھر بھیجتے ہیں، یوں شہر
کے گوشے گوشے میں کلمۂ خیر کہنے والوں کے گروپ پیدا ہو جاتے ہیں اور
ہوا کے جھونکوں سے ایک دوسرے کو نوازتے ہیں!
ڈاکٹر آغا سہیل کو اس سطح پر آنے کی ضرورت نہیں ہے وہ آئے گا
بھی نہیں، کیونکہ بہرحال ان کا ایک معیار ہے، وہ ٹھوس آدمی ہیں،
شرفا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔۔۔۔
بحیثیت مجموعی بھی ڈاکٹر وضع دار آدمی ہے، ٹال مٹول والا رویہ
نہیں رکھتا جتنا کام کر سکتا ہے اتنے کی حامی بھرتا ہے اور کر بھی دیتا ہے۔
سماجی ربط ضبط میں ٹھیک ٹھاک، رکھ رکھاؤ میں لکھنوی انداز،
دستر خوان کا بھی ماٹھا نہیں۔۔۔ اور پھر سب، سوا یہ کہ، گھر کی آب و ہوا
معتدل، خوشگوار، سلجھے ہوئے طور طریقے، چیلے سے گرو تک سلیقہ مند۔

اٹھنا بیٹھنا، چلنا، بات کرنا، ہنسنا، ہر معاملے میں لے اور سر کی ہم آہنگی .....!

مگر پتہ نہیں، مجھے یہ کیوں پسند ہے کہ کبھی کبھی آدمی بے سُرا ہو جائے بالکل سائینٹیفک رویہ منجمد کر دیتا ہے، کبھی کبھی انتشار اچھا لگتا ہے جیسے پہاڑوں، ندیوں، گھاٹیوں اور درختوں کی بے ترتیبی میں حسن ہوتا ہے، فطرت کی کجیوں کو بالکل ہی مفلوج کر دینے سے زندگی کی رونق ختم ہو جاتی ہے .....

تو پھر، ڈاکٹر اگر سر اٹھاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ عذرا اصغر کو حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔ سائرہ ہاشمی تو خیر توں ماں کر کے خاموش ہو گئیں ..... ہمارا منیر نیازی ہے کبھی کبھی غلط سر پہ انگلی رکھتا ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے .....

انیس ناگی بھی ہے، گھاس تو خیر کسی کو کیا ڈالے گا، تنکے کی جگالی بھی برداشت نہیں کرتا۔ گھر بیٹھے بیٹھے رد اسناد کے حکم نامے جاری کرتا ہے تو سارے لاہور میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

اب ایسی بھی کیا احتیاط و تدابیر، کہ آدمی ڈاکٹر ٹیمین بن جائے اور پھر جب سے باجی بانو قدسیہ نے ادیبوں میں کمینگی کا سراغ لگایا ہے تو ہر آدمی اس کے مظاہرے پہ تلا ہوا ہے، کیونکہ بقول بانو، کمینگی ایک اضافی کوالیفیکشن ہے جو جتنا کمینہ ہے اتنا بڑا ادیب ہے۔ بانو کے اس اعلان سے جہاں سائرہ ہاشمی کو دکھ ہوا کہ اپنی معصومیت کی وجہ سے بڑی ادیبہ نہ کہلا سکیں، وہاں مجھے خوشی ہوئی کہ خاکہ لکھتے وقت تھوڑی بہت کمینگی کا مظاہرہ کرتا ہی رہتا ہوں، یوں نہایت آسانی سے صف اول میں آگیا ہوں ....!

ڈاکٹر آغا سہیل کے لیے لمحہ فکریہ .....؟

اب اگر بانو قدسیہ اور ان کے میاں کو بھی بڑے ادیب کہلوانے کا شوق ہے تو ظاہر ہے کمینگی کا اعتراف بھی کرتا ہو گا۔

ویسے اگر بانو قدسیہ کے اس فارمولے کو تسلیم کر لیا گیا تو ہمارے ادب میں کمینگی کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔

میں تو بانو کے فارمولے کو اس لیے بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں آنے والی نسل کے لیے رہنمائی کا اصول بھی متعین ہو گیا ہے.....اب بھاری بھرکم تخلیقات کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بڑا ادیب بننے کیلئے تھوڑی بہت کمینگی کا نسخہ ہی تیر بہدف ہو گا۔

تو تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کا دَور ختم ہو چکا ہے.....ڈاکٹر آغا سہیل کو اگلی صف میں آنا ہے یا تیسری صف میں رہنا ہے یہ ان پر موقوف ہے۔ ہم نیک، بد حضرات کو سمجھاتے رہتے ہیں۔

◘ ◘

خود ساختہ
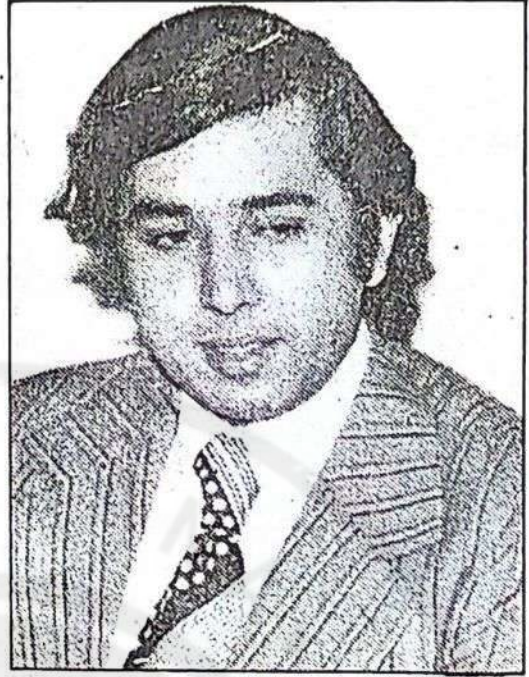
سعادت سعید

لیکچرار ہے، پروفیسر بھی کہہ دیں تو برا نہیں مانتا!
حلقے کا الیکشن لڑا ہار گیا مگر ہمارے ملک میں بیلٹ ہارنے سے کوئی نہیں ہارتا، ہارتا وہ ہے جو ہمت ہار جائے!
سعادت سعید نے ہمت نہ ہاری، حلقہ بنایا اور چلا لیا۔
یہ امتیاز بھی ہمارے ہی ملک کو حاصل ہے کہ جیتنے والا گیٹ سے باہر ہوتا ہے اور ہارنے والا گیٹ کے اندر، باہر والا دہائی دیتا ہے، اندر والا مذاق اڑاتا ہے۔

سعادت نے بھی یہ اصول یہیں سے اپنایا اور نہایت خوش اسلوبی سے اپنایا۔ وہ کرسی پر براجمان ہے کہ یہی ہمارا دستور ہے۔ اس سعادت میں مبارک احمد بھی اس کا شریک ہے یا سعادت سعید مبارک احمد کا شریک ہے۔ دونوں کے درمیان کچھ گھپلا ہے۔ کبھی آپس میں مونچھیں ٹکراتی ہیں۔ کبھی صلاح کار ہوتے ہیں۔ دونوں میں بندر بانٹ کا چکر چلتا رہتا ہے۔ لیکن دونوں باعمل آدمی ہیں۔

ایک گجرات سے آیا، دوسرا ساہیوال سے اور ناجائز طور پر حلقۂ ارباب ذوق پر قابض ہو گئے. ناجائز کے معنی چونکہ ہمارے ملک میں جائز کے ہوتے ہیں. اس لیے ہمارے بے چہرہ شہر کے ادیبوں نے بھی اسے جائز مانا ......

جیسا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں ہوتا ہے. صبح بدلو شام بدلو، بس کرسی پر بیٹھنا شرط ہے. ذرا جم کر بیٹھو ساری دنیا مان جائے گی.

سعادت سعید کو بھی جم کر بیٹھنا آگیا ہے. ہر چوتھے پانچویں روز اہتمام شام کے بہانے کسی جغادری ادیب کو پکڑ لاتا ہے اور چن چن کر کلمہ خیر کہنے والوں کو اکٹھا کرتا ہے اور بزعم خوایش اسے غیر فانی قرار دے کر بانسری بجاتا ہے.

اسے کلمۂ خیر میں خود بھی پیش پیش ہوتا ہے.

یہ الگ بات ہے کہ نظریاتی طور پر ان غیر فانی لوگوں سے سعادت سعید کو اختلاف ہوتا ہے. مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے. یہ تو بیسویں صدی کا رویہ ہے .... کہ اندر بنیان کا رنگ کچھ ہو، اوپر سے وفا شعاری کا رنگین .... اوڑھ لو .... اپنی نیاز مندی کا اظہار کرو اور خود کو جان نثار ثابت کر کے مستقبل محفوظ کر لو. تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے !

اب الزام لگانے والے الزام لگاتے پھریں کہ سعادت سعید مصلحت اندیش ہے. میں تو اسے دور اندیش کہوں گا.... ویسے سعادت خوبصورت آدمی ہے. خدوخال کے اعتبار سے اور رنگ وصورت کے لحاظ سے بھی مگر لڑکیاں اسے اس لیے پسند نہیں کرتیں کہ اس کی توند نکل آئی ہے .... ! کہ یہ آخر ان کا حق ہے !!

اس عمر میں توند اس کی دور اندیشی سے لگا نہیں کھاتی۔
کاش وہ امجد اسلام امجد کی طرح گنجا ہوتا پیٹ سے نہ ہوتا پیٹ سے بھی ہوتا تو کم از کم تخلیقی پیٹ سے ہوتا۔ سنا ہے سوچنے والے لوگوں کے پیٹ نہیں ہوتے۔ وہ خونِ جگر پیتے ہیں اور کڑھ کڑھ کر جیتے ہیں۔
شاید یہی وجہ ہے کہ سعادت سعید نے آج تک کوئی چونکا دینے والی چیز نہیں لکھی۔ وہ جس طرح کے مضامین لکھتا ہے، بہت گنجل ہوتے ہیں مراد ڈھونڈو نہیں ملتا۔
تنقید سچائی چاہتی ہے۔ ہمت و جرأت چاہتی ہے۔ تنقید حرف تقدس ہے جب کہ سعادت سعید کی سرشت صلح کل آدمی کی سرشت ہے اور وہ ٹھوس رویے کا فن کار نہیں ہے ...
جب وہ مضمون پڑھتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا سونے کے نوالے لے رہا ہو، بار بار داد طلب نگاہوں سے لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر غبی لوگ نوٹس نہیں لیتے بلکہ حیران ہوتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں کہ بے چارے کو جانے کیا بیماری ہے، روٹی جیسی نعمت سے محروم ہے۔
سعادت سعید پنجابی لہجے میں اُردو بولتا ہے۔ جیسا کہ میں پشتو لہجے میں بولتا ہوں۔ لیکن ہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ مجھے اس کے پنجابی لہجے میں اُردو بولنے پر اعتراض نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں اسے یہ لہجہ ماں کے دودھ کے ذائقے سے ملا ہے جبکہ میرے پشتو لہجے پر وہ طنزاً مسکراتا ہے۔ خود بھی محظوظ ہوتا ہے۔ لوگوں کو بھی آنکھیں مار کر اس سے تلطّف میں شریک کرتا ہے۔
اگر یہ ایک استاد کا رویہ نہیں ایک مانیٹر کا رویہ ہے تو اس میں حرج بھی نہیں کیونکہ مبارک احمد جیسے کمزور کلاس کے مانیٹر کا رویّہ بالکل اسی طرح کا ہونا چاہیئے اور اس میں شک نہیں وہ کامیاب مانیٹر ہے۔

رجسٹر حاضری میں سو فیصد حاضری لگتی ہے اور اوگرائی مسمع سود وصول کرتا ہے اس سے زیادہ مبارک احمد کو اور کیا چاہئے ؟ جب کہ نثری نظم کے محاذ پر بھی وہ اس کی اعانت کرتا ہے۔

مبارک احمد معصوم آدمی ہے۔ اسے سعادت جیسے فعال اور متحرک دوست کی ضرورت بھی ہے اور ضرورت کے سامنے سر جھکانا بیسویں صدی کی ریت ہے۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ سعادت سعید بھی آسرا اور توقعات لے کر آگے بڑھتا ہے تو پھر کیا حرج ہے۔ اگر وہ بائیں بازو والوں کے ساتھ ہے دائیں بازو والوں کے بھی ساتھ ہے اور رجعت پسندوں کا بھی دم بھرتا ہے۔

اور اس پر طرّہ یہ کہ انتظار حسین جیسے ممتاز ادیب بھی اس رویّے کو درست سمجھتے ہیں تو ہمیں شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہم خود ہی غلط نہ ہوں...؟

کیونکہ ہم غلط لوگ ان دوسرے غلط لوگوں کے ہمنوا ہیں کہ الیکشن ضروری ہے۔ چاہے ادبی سطح پر ہو یا قومی سطح پر!؟

❋❋

ڈاکٹر آغا یمین

آغا یمین غالباً ڈاکٹر بھی ہے، فارسی کا استاد ہے اور شعبہ فارسی کا سینئر پروفیسر! ہمارے ملک میں معجزے تو ہوتے ہی رہتے ہیں !!

آغا یمین اچھا آدمی ہے. صلح سلامتی اس کے خمیر میں رچی بسی ہوئی ہے.

ہمارے ایک وزیر تھے، سابق وزیر، حاکمین خان! وزیر جیل خانہ جات... انہوں نے سنا تھا، وزیر صاحب تقریر کرتے ہیں تو ملک میں فیکٹریوں کارخانوں کا جال بچھانے کا ذکر ضرور کرتے ہیں. انہوں نے بھی فرائضِ منصبی ادا کرتے ہوئے فرمایا :

"میرا بس چلا تو اس ملک میں جیلوں کا جال بچھا دوں گا !"

آغا یمین کا بس چلے تو ادبی حلقوں کا جال بچھا کر انہیں نیشنلائز کر دے اور بولنے کا حق اپنے لیے محفوظ کر لے !

آغا یمین اچھا آدمی ہے. ادبی حلقوں میں جو آدمی بھی مضمون پڑھتا ہے سب سے پہلا ہاتھ آغا یمین کا کھڑا ہوتا ہے. آغازِ بحث وہی کرتا ہے اور کھل کر مضمون اور صاحب مضمون کی تعریف کرتا ہے. نفسِ مضمون سے کلّی اتفاق کرتا ہے.

اگر کوئی دوسرا نقاد مضمون پر تنقید کرتا ہے اور دلائل سے مضمون کو رد کرتا ہے تو آغا یمین اس سے بھی اتفاق کرتا ہے. اگر کوئی تیسرا نقاد

کسی اور زاویہ نگاہ سے مضمون کا رخ متعین کرتا ہے تو آغا یمین کو اس سے بھی اتفاق ہوتا ہے!

آغا یمین اچھا آدمی ہے. تعلیم یافتہ آدمی ہے. کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا۔

اسے حلقہ نوردی کا ازحد شوق ہے. جس دن وہ ادبی حلقوں میں نظر نہیں آئے گا، غالباً وہ قیامت کا دن ہوگا!

حلقے میں آنے والا ہر ادیب چھوٹا ہو یا بڑا، سینئر ہو یا جونیئر، آغا یمین ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کرتا ہے۔ مسکراتا ہے. وش کرتا ہے وہ کسی سے سلام کا متوقع نہیں ہوتا۔ ہمیشہ خود پہل کرتا ہے. یہی اس کا بڑا پن ہے کہ اس نے سلام کے لین دین کا کھاتہ نہیں کھولا۔

وہ اچھا آدمی ہے. قناعت پسند آدمی ہے. مرنجاں مرنج آدمی ہے۔ خدا کرے وہ زندہ و پائندہ رہے. لیکن جس دن وہ اس جہاں سے کوچ کر جائے گا، ادبی محفلوں کا سُونا پن دیدنی ہو گا!

کبھی کبھی وہ بحث میں الجھ بھی جاتا ہے، اور دھاگے کا سرا نہیں ملتا۔ لیکن کبھی کبھار وہ بڑی دور کی کوڑی لاتا ہے، اور سب کو حیران کر دیتا ہے۔

مگر اپنی صلح جو مزاج کی وجہ سے پسپائی اختیار کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتا تب محسوس ہوتا ہے کورس یہیں تک محدود تھا۔ کورس سے کے ادراک کے معاملے میں تو بس یہی کہا جا سکتا ہے۔۔۔

تا نہ بخشند خدائے بخشندہ۔

ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے پوچھا۔۔ "آغا یمین کون ہیں؟" جواب ملا۔۔ "خدا کی مخلوق!"

پہلے نے کہا۔۔ "ہم نے تو سنا ہے، لکھتا ہے، پھاڑتا ہے، پھر لکھتا ہے، پھر پھاڑتا ہے۔۔ آج تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچا!"

ایک اور صاحب نے کہا.... "کپڑے پہننا ہر آدمی کا تہذیبی حق ہے"!
ایک صاحب بولے.... کان پر قلم جمانا بھی انسان کا بنیادی حق ہے۔
کون کیا ہے، یہ فیصلہ تو وقت کرے گا۔"
ایک اور صاحب نے کہا... "لکھنے دو بے چارے کو، اپنے کاغذ
کالے کرتا ہے، اپنا وقت ضائع کرتا ہے، کسی کی برائی اور غیبت کرنے
سے تو یہ بدرجہا بہتر کام ہے"!
میں نے آغا یمین کے متعلق جس سے بھی پوچھا وہ ہنس پڑا۔ کسی
نے بھی سنجیدگی سے نوٹس نہ لیا۔
کسی نے بھی متانت سے جواب نہ دیا۔
میں حیران تھا چھوٹے بڑے ہر آدمی کا ایک سا لہجہ،
مجھے آغا یمین کی معصومیت پر پیار آگیا....!
کہ وہ کس شان سے ادبی محفلوں میں دندناتا ہے مگر اسے معلوم
نہیں کہ لوگ اس بے ضرر آدمی کو بالکل محسوس نہیں کرتے... اور یہ کتنا
بڑا المیہ ہے کہ بزعم خود ایک اہم آدمی دوسروں کے لیے کتنا غیر اہم ہے!
لیکن اس کے باوجود یہ بات تو ماننا پڑے گی کہ آج سلف پروجیکٹ
کا زمانہ ہے (ہر آدمی مجید امجد کی طرح درویش، بے نیاز تو نہیں ہو سکتا)
اگر آغا یمین میں گروپ بندی کی اہلیت نہیں ہے تو اس کے اظہار ذات
کی خواہش کو بھونڈے پن کے کھاتے میں کیوں ڈالا جائے؟
اگر وہ ہر جگہ گھستا ہے،
"لوٹتا ہے تو یہ نفسیاتی معاملہ ہے۔
ہمارا تمہارا کیا بگاڑتا ہے۔ کم از کم وہ اپنے بچوں کو تو مطمئن کر سکتا
ہے کہ "دیکھو.... آج اخبار میں تمہارے ابو کا نام پھر چھپ گیا ہے"!

رحیم گل کی ادبی فتوحات

تاج سعید

کوہاٹ کے جنوب میں بلند و بالا پہاڑوں اور بے آب و گیا میدانوں کی سرزمین تنگ درہ ہے۔ جہاں کے تنومند اور جفاکش باشندے میلوں ٹھیلوں کے رسیا ہیں اور ڈھول سرنا کی آواز سن کر جن کے قدم آپ ہی آپ رقص کرنے لگتے ہیں، پاکستان کے بازوئے شمشیرزن اور جانباز قبیلے خٹک کے فرزند اسی علاقے کے پروردہ ہیں۔

خوشحال خان خٹک کے قبیلے کا ایک فرزند رحیم گل ہے۔ یہ قد آور شخص قد بت کے لحاظ سے پکا پشتون ہے اور خو بو کے لحاظ سے ایک مخلص اور ملائم انسان۔ اس کی انسان دوستی کے بارے میں اس کے احباب نے بہت سارے مضامین لکھے ہیں۔ میں اس بات کا اعتراف کر کے کوئی نئی بات آپ کو نہیں بتا رہا۔ کیونکہ اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں کہ رحیم گل یاری کرنے میں بے ریا ہے وہ آپ پر اپنے خلوص کی دولت اس طرح نچھاور کرتا ہے۔ جس طرح لوگ کسی کا استقبال کرنے کے لیے پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ اس کا پیار بھی ابر رحمت کی طرح چھاجوں برستا ہے اور آن کی آن میں سارے وجود کو بھگو دیتا ہے۔ اس سے گفتگو کرتے وقت یہ خیال بار بار ذہن میں آتا ہے۔ کہ

ناول نگار رحیم گل یہ نہیں ہے بلکہ یہ کسی دوسری شخصیت کا کرشمہ ہے جو ہمارے لیے کہانیاں، خاکے اور ناول تخلیق کرتا ہے۔ اس بات کا اظہار جب میں نے زیتون بانو اور خاطر غزنوی سے کیا تو وہ دونوں بھی میرے ہمنوا نکلے۔ ان دونوں کو بھی حیرت ہے کہ سیدھا سادھا، بھولا بھالا سا نرم نرم سا شخص بالکل وہ رحیم گل نہیں ہے جو تن تارا را، پیاس کا دریا، زہر کا دریا، پورٹریٹ داستان چھوڑ آئے اور جنت کی تلاش کا خالق ہے۔

دوست رحیم گل کا دوسرا رخ ایک ادیب کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس صورت میں جب ہم اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ رحیم گل بطور فن کار بھی مخلص اور بے ریا ہے۔ وہ لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں۔ وہ اپنے کرداروں سے بھی بالکل دوستوں جیسا سلوک کرتا ہے اور کسی بھی کردار کو کوئی گزند پہنچائے بغیر کہانی کے انجام تک اس کا ساتھ ایک ہم سفر کی طرح دیتا ہے اور اس کی اچھائیاں، اس کی برائیاں، اس کی ساری کی ساری کمزوریاں قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اس کا قاری بھی بے حد معصوم ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ بھی کسی قسم کی فریب کاری یا فراڈ نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ اپنے قاری کو اپنے کرداروں کے بارے میں جو تفصیل بھی بتاتا ہے اس میں سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح سورج کی آمد سے سارا عالم روشنی میں ڈوب جاتا ہے اور اندھیرے کی حکمرانی تاخت و تاراج ہو جاتی ہے۔

زیتون بانو نے رحیم گل کے ناول "پیاس کا دریا" کے بارے میں لکھا تھا کہ "پیاس کا دریا کا تعارف ایک جنسی ناول کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناول صداقتوں کا آئینہ ہے۔ وہ صداقتیں جن کے بارے میں ہم سوچ تو سکتے ہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ناول

کے مصنف نے تو صرف اسی آئینہ حقیقت نما" میں ہمیں اپنا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض نازک مزاج اس کا سامنا کرنے سے کترائیں گے۔ (قند مئی جون ۷۴ء)

اور داستان چھوڑ آئے، کے بارے میں عذرا اصغر نے تحریر کیا ہے:

"سچ ہر زمانے اور ہر دور میں گردن زدنی رہا ہے۔ مگر خدا کے نیک بندے آج بھی بلا خوف و خطرہ سچ بولتے آرہے ہیں اور لوگوں کو سچ کی اس کڑوی گولی کو بہرحال نگلنا پڑ رہا ہے، داستان چھوڑ آئے۔ جن لوگوں نے مجھ سے لے کر پڑھی ان میں سے بشتر کو یہ کڑوی گولی ہی لگی۔ رحیم گل نے خود اس خطرے کو محسوس کیا اور کتاب بھیجتے ہوئے مجھے لکھا:

"کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ آپ کو بھیجنا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا ہوں کہیں آپ کے گھر کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔ میں دس سال سے جس محلے میں رہ رہا ہوں اور جہاں پڑوس کی خواتین مجھے بھائی کہہ کر پکارتی تھیں اور بے دھڑک میرے گھر چلی آیا کرتی تھیں۔ اب مجھ سے کترانے لگی ہیں۔ مجھے دیکھ کر پردہ کر لیتی ہیں، یہی نہیں بلکہ میرے گھر آنے سے پہلے معلوم کر واتی ہیں کہ گل صاحب گھر پر تو نہیں ہیں۔"

سچی بات یہ ہے کہ رحیم گل نے اپنی اس خود نوشت میں بقول ایوب صابر اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کی "میرے خیال میں منافقت کا عنصر پشتونوں کی سرشت میں سرے سے ہے ہی نہیں اور رحیم گل نے اسی روایت کے سہارے اپنی آپ بیتی بیان کی ہے اور اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے کسی بھی کردار کے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔ حتیٰ کہ جن خواتین کے کردار اس ناول میں ایک ایک کر کے آتے ہیں۔ انہوں نے گل کے ساتھ پیار و محبت کا کھیل کھیلتے وقت کہیں بھی اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیا۔ رحیم گل نے سبھی کرداروں کے ساتھ عزت و تکریم

کا برتاؤ کیا ہے اور خواتین کا ذکر تو انہوں نے بے حد خلوص کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک روایتی پٹھان کی شان برقرار رکھی ہے۔ دوستوں نے ناول" داستان چھوڑ آئے" تو ناول سے ہٹ کر کوئی چیز قرار دیا ہے۔ ایک صاحب اسے خود نوشت کہنے پر مصر ہیں۔ اور ایک ساتھی نے اسے رپورتاژ کہا ہے۔ اسی طرح ہمارے ایک اور دوست نے اس ناول کو خود نوشت اور رپورتاژ کے بین بین کی کوئی چیز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

در اصل افسانہ نگار اور ناول نگار جب بھی کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو اس کی بنیاد حقائق پر ہوتی ہے۔ اسے کوئی واقعہ، کوئی کردار جب بھی متاثر کرتا ہے۔ تو وہ زندگی ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں جھوٹ کا عمل دخل کم ہوتا ہے۔ اس لیے ہم اسے سچا واقعہ یا خود نوشت قرار دے دیتے ہیں۔

افسانے اور خود نوشت یا ناول کے الگ الگ سانچے ہیں۔ اس لیے مصنف واقعات کی خصوصیت کو پرکھ کر اس کے لیے کوئی سانچہ منتخب کرتا ہے۔" داستان چھوڑ آئے" کے واقعات اس کے متقاضی تھے کہ انہیں خود نوشت کے انداز میں قلم بند کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب پر خود نوشت کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ پھر مصنف نے خود اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ واقعات اس کی زندگی کا حصّہ ہیں۔ اس لیے انہیں خود نوشت سمجھنے میں ہم سب حق بجانب ہیں۔" داستان چھوڑ آئے" میں واقعات کا تسلسل، بہاؤ اور روانی ایسی ہے کہ میں اسے بہتا دریا کا عنوان دینا پسند کروں گا۔ ایک ایسا دریا جس کے بہاؤ میں مصنف کے ساتھ دوسرے کردار بھی بہتے چلے جاتے ہیں اور مصنّف کناروں کو چھوئے بغیر آگے نکل جاتا ہے۔ اس منزل کی طرف جو اسے

اپنی جانب بلا رہی ہے۔

"جنت کی تلاش" اردو زبان کا پہلا ناول ہے جس میں وہ گہری اور گھمبیر الجھنیں موضوع بنی ہیں۔ جنھوں نے صدیوں بڑے بڑے حکیموں فلسفیوں، داناؤں اور دانشوروں کو جستجوئے مسلسل میں مبتلا کر رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کچھ اس ناول میں کہا گیا ہے وہ رحیم گل کے برسوں کے وسیع مطالعے اور گہری سوچ کا نتیجہ ہے۔ مگر کسی ایک مقام پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ناول نگار نے جو کچھ پڑھا یا سوچا، اسے جا دبلے جا اگلتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے حیرت انگیز فن کاری اور مسحور کن سلیقے سے ان افکار کو ناول کے تین مرکزی کرداروں میں بانٹا ہے اور ان کے مکالموں کے تانے بانے سے قاری پر کتنے بہت سارے اسرارِ حیات دکائنات کھولتا چلا گیا ہے۔ اس بہت بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کو رحیم گل نے ایک ماسٹر کرافٹس مین کی طرح شروع سے آخر تک اپنی پُر اعتماد گرفت میں رکھا ہے اور ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جو اپنے موضوع اور نوعیت اور بنت کے لحاظ سے کم سے کم اردو زبان میں تو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

اظہارِ تشکر

رحیم گل مرحوم کی کتاب "خدوخال" میں جن نامور شخصیات کے خاکے شامل ہیں، ان کی تصاویر کا حصول ایک ایسا مرحلہ تھا جو میرے لئے تنہا سر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس آڑے وقت میں میرے دوست ناصر زیدی صاحب اور اظہر جاوید صاحب نے دستگیری کی۔ زیادہ تر تصاویر ناصر زیدی صاحب نے فراہم کیں اور بقایا چند تصاویر اظہر جاوید صاحب نے مہیا کیں۔ میں ان دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ واقعی اگر یہ بروقت تعاون نہ کرتے تو کتاب کی اشاعت میں مزید تاخیر ہو سکتی تھی۔

سعید اے شیخ